محمد بن قاسم

نسیم حجازی

پہلا حصہ

محمد بن قاسم

پہلا حصہ

نسیم حجازی

جہانگیر بک ڈپو
لاہور ۔ راولپنڈی ۔ ملتان ۔ فیصل آباد ۔ حیدر آباد ۔ کراچی

آپ کے مشورے اور شکایات کے لئے۔
E-mail:info@jbdpress.com
www.jbdpress.com

اشاعت: 2006
سٹاکسٹ: جہانگیر بک ڈپو
سرورق: JBD آرٹ سیکشن، لاہور
قیمت: -/225 روپے



ناشر: عدیل نیاز، آفس: 257 ریواز گارڈن، لاہور۔فون: 042-7213318 فیکس: 042-7213319
سیلز ڈپو: اردو بازار، لاہور فون: 042-7220879، سیلز ڈپو: اردو بازار، کراچی۔فون: 021-2765086
سیلز ڈپو: اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک، راولپنڈی۔فون: 051-5552929
سیلز ڈپو: نزد یونیفارم سنٹر جامع مسجد صدر، رسالہ روڈ حیدر آباد۔ فون: 0300-3012131
سیلز ڈپو: اندرون بوہڑ گیٹ، ملتان۔فون: 061-4781781
سیلز ڈپو: کوتوالی روڈ، نزد امین پور بازار، فیصل آباد۔فون: 0333-4469077
نیاز جہانگیر پرنٹرز، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور نے پرنٹ کی۔فون: 042-7314319

پہلا حصہ

ناہید

دوسرا حصّہ

کمسن اور نوجوان سالار

حصّہ اوّل

ناہید

ابوالحسن

ہندوستان کے مغربی ساحل کی اہم بندرگاہوں اور جزیرہ سراندیپ[1] کے ساتھ ایک مدت سے عربوں کے تجارتی تعلقات چلے آتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں چند عرب تاجر سراندیپ میں آباد ہوگئے تھے۔ اور جب عرب میں ایک نئے دین کا چرچا ہونے لگا، تو یہ دین اُن تاجروں کو اپنے آباؤاجداد کے مذہب کو ترک کرنے پر آمادہ نہ کرسکا۔ لیکن ایرانیوں اور رومیوں کے مقابلے میں عربوں کی شاندار فتوحات کی خبریں سُن کر اُن کی قومی عصبیت جاگ اُٹھی۔ ایران، عرب کے مقابلے میں ایک متمدن ملک سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ہندوستان کے بازاروں میں عرب کے مقابلے میں ایران کی مصنوعات کی زیادہ قدر تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے حکمران ایران کو ایک طاقتور ہمسایہ خیال کرتے تھے، اور عربوں کے مقابلے میں ایرانی تاجروں کو زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر شام سے کوئی قافلہ آجاتا، تو روما کی قدیم سطوت سے مرعوب ہندوستانی انھیں بھی عربوں سے زیادہ مراعات دیتے، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی شاندار

---

[1] موجودہ سری لنکا یا سیلون

فتوحات نے عربوں کے متعلق ہمسایہ ممالک کے باشندوں کا زاویۂ نگاہ تبدیل کر دیا۔

سراندیپ اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں آباد ہونے والے وہ تاجر جو ابھی تک عرب کے اندرونی انقلاب سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ کفر کے مقابلہ میں اسلام کی فتوحات کو ایرانیوں اور رومیوں کے مقابلہ میں عرب کی فتوحات سمجھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ عربوں کے نئے دین سے اُن کی نفرت اب محبّت میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اُس زمانے میں جن لوگوں کو عرب جانے کا اتفاق ہوا' وہ اسلام کی نعمتوں سے مالا مال ہو کر واپس آئے۔

عبد الشمس عرب تاجروں کا سرگروہ تھا۔ اس کا خاندان ایک مدّت سے سراندیپ میں آباد تھا۔ وہ اسی جزیرے میں پیدا ہوا، اور اسی جگہ آباد ہونے والے ایک عرب خاندان کی لڑکی سے شادی کی۔ جوانی سے بڑھاپے تک اُس کے بحری سفر بھی سراندیپ سے کاٹھیاواڑ تک محدود رہے۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ عرب میں اس کے خاندان کے دوسرے افراد کون ہیں اور کس جگہ رہتے ہیں۔

دوسرے عربوں کی طرح وہ بھی مادرِ وطن کے ساتھ اُس وقت دلچسپی لینے لگا۔ جب یرموک اور قادسیہ میں مسلمانوں کی شاندار فتوحات کی خبریں دنیا کے ہر گوشے میں پہنچ چکی تھیں۔

موجودہ راجہ کے باپ کو انہی خبروں نے عرب کے ایک گمنام تاجر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر آمادہ کیا تھا۔ اُس نے عبد الشمس اور اُس کے ساتھیوں کو دربار میں بلایا اور بیش قیمت تحائف دے کر رخصت کیا۔

۸۵ھ میں اپنے باپ کی وفات کے بعد نئے راجہ نے تخت نشین ہوتے ہی عبد الشمس کو بلایا اور کہا۔ "مدّت سے ہمارے ملک میں تمہارے ملک کا کوئی تاجر نہیں آیا، میں عرب کے تازہ حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارے نئے دین کے ساتھ دلچسپی ہے۔ اگر

تم وہاں جانا پسند کرو تو میں تمہارے لیے ہر سہولت مہیّا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

عبد الشمس نے جواب دیا۔ "آپ کے مُنہ سے میرے دل کی دبی ہوئی آواز نکلی ہے۔ میں جانے کے لیے تیار ہوں!"

پانچ عرب تاجروں کے سوا باقی سب عبد الشمس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

دس دن بعد بندرگاہ پر ایک جہاز کھڑا تھا اور عرب اپنے بال بچوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ عبد الشمس کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ اس نے سینے پر پتھر رکھ کر اپنی اکلوتی بیٹی کو الوداع کہا۔ اس لڑکی کا نام سلمیٰ تھا۔ شہر میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اسے نسوانی حسن کا بلند ترین معیار تصوّر نہ کرتا ہو۔ شاہسوار اسے تند و سرکش گھوڑوں کو دوڑاتے اور بہترین تیراک اسے خوفناک آبشاروں میں کودتے اور سمندر میں مچھلی کی طرح تیرتے دیکھ کر دم بخود رہ جاتے تھے۔

عبد الشمس کی روانگی کے بیس دن بعد کاٹھیاواڑ کے تاجروں کا ایک جہاز بندرگاہ پر رُکا اور عبد الشمس اور اس کے دو ساتھیوں نے اُتر کر یہ خبر سُنائی کہ ان کا جہاز اور دُوسرے ساتھی سمندر کی لہروں کا شکار ہو چکے ہیں اور اگر کاٹھیاواڑ کے تاجروں کا جہاز وقت پر نہ پہنچتا تو وہ بھی چند ساعت اور پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد ڈوب جاتے۔

راجہ نے اس حادثے کی خبر نہایت افسوس کے ساتھ سُنی۔ سندھی تاجروں کے سردار کا نام دلیپ سنگھ تھا۔ راجہ نے اُسے دربار میں بلایا اور تین عربوں کی جان بچانے کے عوض اسے تین ہاتھی انعام دیے — راجہ کو مہربان دیکھ کر دلیپ سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے وہاں آباد ہونے کا خیال ظاہر کیا۔ راجہ نے خوشی سے ان کی یہ درخواست منظور کی اور شاہی خزانے سے ان کے لیے

مکان تعمیر کروا دیے۔

چند سال کی وفادارانہ خدمات کے بعد دلیپ سنگھ راجہ کے بحری بیڑے کا افسرِ اعلیٰ بنا دیا گیا۔

(۲)

اس واقعے کے تین سال بعد ابوالحسن پہلا مسلمان تھا جسے تجارت کا ارادہ اور تبلیغ کا شوق اس دُور اُفتادہ جزیرے تک لے آیا۔

کئی ہفتوں کے سفر کے بعد ایک صبح ابوالحسن اور اس کے ساتھی جہاز پر کھڑے سراندیپ کے سرسبز ساحل کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بندرگاہ کے قریب مرد، عورتیں اور بچے کشتیوں پر سوار ہو کر اور چند تیرتے ہوئے لوگ جہاز کے استقبال کو نکلے۔ ایک کشتی پر ابوالحسن کو جزیرے کی سیہ فام اور نیم عُریاں عورتوں کے درمیان ایک اجنبی صورت دکھائی دی۔ اس کا رنگ سُرخ و سفید اور شکل و صورت جزیرے کے باشندوں سے بہت مختلف تھی۔ دوسری کشتیوں سے پہلے جہاز کے قریب پہنچنے کے لیے وہ اپنی کشتی پر کھڑی دو تنومند ملاّحوں کو جو کشتی کے چپّو چلا رہے تھے، ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔

یہ کشتی تمام کشتیوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی جہاز کے ساتھ آ لگی۔ لڑکی نے ابوالحسن کی طرف دیکھا اور اس نے بیباک نگاہوں کا جواب دینے کی بجائے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا —— ابوالحسن کے ساتھیوں کو بھی عورتوں کا نیم عُریاں لباس پسند نہ آیا۔ حسین لڑکی نے جہاز والوں کی بے اعتنائی کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے سراندیپی زبان میں کچھ کہا لیکن جہاز پر سے کوئی جواب نہ آیا۔

اچانک ابوالحسن نے کسی کی چیخ پکار سُن کر نیچے دیکھا۔ کشتی سے آٹھ دس گز کے فاصلے پر وہی خوبصورت لڑکی پانی میں غوطے کھا رہی تھی اور کشتی والے

اس کی چیخ پکار کے باوجود سخت بے اعتنائی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ابوالحسن نے پہلے رسّی کی سیڑھی پھینکی لیکن جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ لڑکی کے ہاتھ پاؤں جواب دے رہے ہیں اور وہ سیڑھی تک نہیں پہنچ سکتی تو وہ کپڑوں سمیت سمندر میں کُود پڑا لیکن لڑکی اچانک پانی میں غائب ہو گئی اور وہ پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں بہت سی کشتیاں جہاز کے گرد جمع ہو چکی تھیں اور جزیرے کے باشندے قہقہے لگا رہے تھے۔

ابوالحسن نے تین مرتبہ غوطہ لگانے کے بعد دل برداشتہ ہو کر سیڑھی کی رسّی پکڑ لی اور وہ جہاز پر چڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اُوپر سے اس کا ساتھی چلّانے لگا۔ "وہ اِدھر ہے، جہاز کے دوسری طرف۔ وہ ڈوب رہی ہے۔ شاید کسی مچھلی نے پکڑ رکھا ہے"۔

مقامی مردوں اور عورتوں نے پھر قہقہہ لگایا۔ ابوالحسن لڑکی کے جہاز کی دوسری طرف پہنچنے کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ تشویش اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس نے جلد ہی پھر غوطہ لگایا اور جہاز کے نیچے سے گزرتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا، اُوپر سے اس کا وہی ساتھی شور مچا رہا تھا:

"وہ ڈوب گئی۔ اُسے مچھلی نگل گئی"۔

ابوالحسن مایوس ہو کر پھر دوسری طرف پہنچا۔ اس دفعہ لوگوں کے قہقہوں میں اس کے ساتھی بھی شریک تھے اور ایک عرب نے کہا "آپ آ جائیے! وہ آپ سے بہتر تیر سکتی ہے"۔

ابوالحسن نے کھسیانہ ہو کر سیڑھی پکڑ لی لیکن ابھی ایک ہی پاؤں اُوپر رکھا تھا کہ کسی نے اس کی ٹانگ پکڑ کر پانی میں گرا دیا۔ اس نے سنبھل کر اِدھر اُدھر دیکھا تو لڑکی تیزی سے سیڑھی پر چڑھ رہی تھی۔

ابوالحسن جہاز پر پہنچا تو اس کے ساتھی پریشان سے ہوکر جزیرے کی لڑکی کے قہقہے سن رہے تھے۔

لڑکی نے ابوالحسن کی طرف دیکھ کر عربی زبان میں کہا۔ "مجھے آپ کے بھیگ جانے کا بہت افسوس ہے۔"

لڑکی کے منہ سے عربی کے الفاظ سن کر سب کی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں۔

ابوالحسن نے پوچھا۔ "کیا تم عرب ہو؟"

لڑکی نے ایک طرف سر جھکا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بالوں کا پانی نچوڑتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں! میں عرب ہوں، ایک مدت سے ہم عربوں کے جہاز کی راہ دیکھا کرتے تھے۔ میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ آپ کیا مال لائے ہیں؟"

ایک عرب لڑکی کو اس لباس میں دیکھنا ابوالحسن اور اس کے ساتھیوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ پریشان ہوکر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

لڑکی نے اپنے سوال کا جواب نہ پاکر پھر پوچھا۔ "میں پوچھتی ہوں آپ کیا مال لائے ہیں؟ آپ حیران کیوں ہیں۔ کیا عرب عورتیں تیرنا نہیں جانتیں۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ اچھا میں خود دیکھ لیتی ہوں۔"

ابوالحسن نے کہا۔ "ٹھہرو! ہم گھوڑے لائے ہیں۔ میں تمھیں خود دکھاتا ہوں لیکن میں حیران ہوں کہ اس جزیرے کے عرب ابھی تک زمانۂ جاہلیت کے عربوں سے بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا انھیں انسانوں کا سا لباس پہننا اور مردوں سے حیا کرنا کسی نے نہیں سکھایا؟"

لڑکی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے جواب دیا۔ "کیا یہ انسانوں کا

لباس نہیں؟"

"نہیں! معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے گھر تک اسلام کی روشنی ابھی تک نہیں آئی۔"

یہ کہہ کر ابوالحسن نے ایک جبّہ اٹھایا اور لڑکی کے کندھوں پر ڈال کر بولا۔ "اب تم ہمارا جہاز دیکھ سکتی ہو۔"

لڑکی نے ابوالحسن کے الفاظ سے زیادہ اس کی شخصیت سے مرعوب ہوکر اپنے عریاں بازوؤں اور پنڈلیوں کو جبّے میں چھپا لیا۔

ابوالحسن کی پونجی پچاس عربی گھوڑے تھے۔ لڑکی نے یکے بعد دیگرے تمام گھوڑوں کا معائنہ کیا اور ایک گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "میں یہ خریدوں گی۔ اس کی قیمت کیا ہے؟"

ابوالحسن نے کہا۔ "تم میں ابھی تک عربوں کی ایک خصوصیت باقی ہے۔ یہی گھوڑا ان سب میں بہتر ہے لیکن تم نہ اس کی قیمت ادا کر سکو گی اور نہ یہ عورتوں کی سواری کے قابل ہے۔ یہ جس قدر خوبصورت اور تیز رفتار ہے، اسی قدر منہ زور بھی ہے۔"

لڑکی اس جواب پر مسکرائی اور بولی۔ "خیر دیکھا جائے گا، آپ نے جہاز اتنی دور کیوں ٹھہرا لیا؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "میں اس ملک کی حکومت سے اجازت لینا ضروری خیال کرتا ہوں۔"

لڑکی نے کہا۔ "سراندیپ کا راجہ ایک مدت سے عربوں کے جہاز کا انتظار کر رہا ہے۔ جہاز کنارے پر لے چلیے! لیجیے راجہ کے امیرالبحر خود ہی پہنچ گئے۔"

دلیپ سنگھ، عبدالشمس سے گہرے تعلقات کی بدولت عربی میں اچھی خاصی استعداد پیدا کر چکا تھا۔ اس نے جہاز پر چڑھتے ہی عربی زبان میں کہا۔ "آپ نے جہاز اتنی دور کیوں ٹھہرا لیا؟"

ابوالحسن کی بجائے لڑکی نے جواب دیا۔" ان کا خیال تھا کہ شاید جہاز کو بندرگاہ پر لگانے سے پہلے راجہ سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہو!"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔" مہاراج آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

لڑکی نے کہا۔" میں جانتی ہوں لیکن اس بات کا خیال رہے کہ وہ سفید گھوڑا میرا ہے اور میں اس کے منہ مانگے دام دوں گی۔" یہ کہہ کر لڑکی نے جبّہ اتار کر ایک عرب کے کندھوں پر پھینک دیا اور بھاگ کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

(۳)

عبدالشمس کو عربوں کے جہاز کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے شہر کے چند معززین کے ساتھ ابوالحسن اور اس کے ساتھیوں کا استقبال کیا، انھیں اپنے گھر اور ان کے گھوڑوں کو اپنے اصطبل میں جگہ دی۔ آن کی آن میں پچاس گھوڑوں کے کوئی دو سو خریدار جمع ہوگئے اور تمام ایک دوسرے سے بڑھ کر بولی دینے لگے۔

دلیپ سنگھ نے مشورہ دیا کہ راجہ کو دکھائے بغیر کوئی گھوڑا فروخت نہ کیا جائے، ممکن ہے وہ تمام گھوڑے خرید لیں۔ عبدالشمس نے دلیپ سنگھ کی تائید کی۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ راجہ کا ایلچی آیا اور اس نے کہا۔" مہاراج عرب تاجروں سے ملنا اور ان کے گھوڑے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

دلیپ سنگھ نے ایلچی سے کہا۔" تم جاؤ اور مہاراج سے کہو ہم ابھی آتے ہیں۔"

یہ کہہ کر ابوالحسن سے مخاطب ہوا۔" ایک گھوڑا شیخ عبدالشمس کی بیٹی نے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُسے یہیں رہنے دیا جائے۔"

ابوالحسن نے کہا۔" اگر شیخ خود اپنے لیے لینا چاہتے ہیں تو مجھے عذر نہیں لیکن وہ لڑکیوں کی سواری کے قابل نہیں۔ وہ بہت سرکش ہے!"

ایک طرف سے آواز آئی۔" نہیں ابّا جی! ان کا خیال ہے کہ ہم اس کی قیمت

ادا نہیں کر سکیں گے۔"

ابوالحسن نے دیکھا۔ وہی لڑکی جسے اس نے جہاز پر دیکھا تھا۔ ایک ہاتھ میں لگام اور دوسرے ہاتھ میں چابک لیے کھڑی تھی لیکن اس دفعہ اس کا لباس عرب عورتوں کا سا تھا۔

ابوالحسن نے قدرے خفیف ہو کر کہا۔" اگر مجھ پر اعتبار نہیں آتا تو تم خود دیکھ لو، اگر تم اُسے لگام بھی دے سکو تو یہی گھوڑا تمھارا انعام ہوگا!"

لڑکی تیزی سے قدم اُٹھاتی ہوئی اصطبل کی طرف بڑھی۔ باقی سب لوگ بھی اس طرف چل دیے۔ لڑکی تمام گھوڑوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد سفید گھوڑے کی طرف بڑھی، گھوڑے نے اُسے دیکھتے ہی چارہ چھوڑ کر کان کھڑے کر لیے۔ لڑکی نے گھوڑے کو تھپکی دی اور وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا۔ اسے دیکھ کر دوسرے گھوڑے رسّے تڑانے لگے۔

ابوالحسن نے کہا۔" ٹھہرو!" اور آگے بڑھ کر گھوڑے کا رسّہ کھول کر باہر لے آیا اور اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ کر کہنے لگا۔" اب آپ ہمّت آزمائی کر سکتی ہیں۔"

لڑکی نے اچانک آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے گھوڑے کا نچلا جبڑا پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے زخمی درندے کی طرح تڑپتے، اُچھلتے اور کُودتے ہوئے جانور کے منہ میں لگام ٹھونس دی۔ تماشائیوں نے حیرانی پر قابو نہ پایا تھا کہ اس نے رسّہ کھولا اور گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوگئی۔ گھوڑا چند بار سیخ پا ہونے کے بعد چھلانگیں لگاتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا۔

شیخ عبدالشمس نے فخریہ انداز میں کہا۔" عرب کی گھوڑیوں نے ایسا گھوڑا پیدا نہیں کیا جس پر سلمیٰ سواری نہ کر سکتی ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ شرط

ہار گئے لیکن اطمینان رکھیے کہ آپ کو اس کی پوری قیمت ادا کی جائے گی۔"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "یہ شرط نہ تھی، انعام تھا اور انعام کی قیمت نہیں لی جاتی۔ خوش قسمت ہے وہ گھوڑا جسے ایسا سوار مل جائے۔"

(۴)

راجہ دیکھنے سے پہلے ہی تمام گھوڑوں کو خریدنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ شاہی خزانے سے جو قیمت ادا کی گئی، وہ عربوں کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ راجہ نے ابوالحسن سے عربوں کے نئے دین اور ان کی فتوحات کے متعلق کئی سوالات کیے۔ دلیپ سنگھ نے ترجمانی کے فرائض انجام دیے۔ ابوالحسن نے تمام سوالات کا جواب دینے کے بعد دین اسلام کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی۔ راجہ نے اسلام کی بہت سی خوبیوں کا اعتراف کرنے کے بعد ابوالحسن سے دوبارہ ملاقات کا وعدہ لے کر اُسے رخصت کیا۔

جب ابوالحسن اپنے میزبان کے گھر واپس پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ سلمیٰ ابھی تک واپس نہیں آئی اور عبدالشمس چند آدمیوں کے ہمراہ اس کی تلاش میں جا چکا ہے۔ ابوالحسن نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد پریشانی کی حالت میں مکان کے صحن میں ٹہل رہا تھا کہ سفید گھوڑا بے تحاشا بھاگتا ہوا اندر آیا۔ گھوڑے کی لگام بھی غائب تھی۔

ابوالحسن نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "خدا معلوم اُسے کیا ہوا۔ یہ گھوڑا سرکش ضرور ہے لیکن گرے ہوئے سوار کو چھوڑ کر آنے والا نہیں اور لگام پاؤں کے نیچے آکر ٹوٹ سکتی تھی، لیکن اس کا گر پڑنا ممکن نہ تھا میں جاتا ہوں۔"

ابوالحسن نے شیخ عبدالشمس کے خادم سے دوسری لگام منگوا کر گھوڑے کو دی اور ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر مکان سے باہر نکلا اور گھوڑے کو اس کی مرضی پر چھوڑ

دیا۔ گھوڑے کی رفتار ظاہر کرتی تھی کہ اس سے بہت زیادہ کام لیا جا چکا ہے۔ گھوڑا چند کوس گھنے جنگل میں سے گزرنے کے بعد ایک ٹیلے پر چڑھا اور ایک آبشار کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ اس سے اوپر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد ابوالحسن گھوڑے سے اُترا اور اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ کر سلمیٰ کو آوازیں دینے لگا۔ دیر تک تلاش کرنے کے بعد وہ تھک کر آبشار کے قریب ایک پتھر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ شام ہونے کو تھی۔ ابوالحسن نے عصر کی نماز ادا کی اور پھر ایک دشوار گزار راستے سے اس مقام تک پہنچا، جہاں سے پہاڑی ندی کا پانی ایک آبشار کی شکل میں نیچے گرتا تھا۔ سلمیٰ چند قدم کے فاصلے پر ندی کے کنارے ایک درخت کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ ابوالحسن کی نظر اُس پر اُس وقت پڑی جب ایک تین چار گز لمبا اور آدمی کی ران کے برابر موٹا اژدہا گھاس میں سے سرکتا ہوا اُس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ ابوالحسن "سلمیٰ! سلمیٰ!" کہتا ہوا بھاگا اور اُس کا بازو پکڑ کر گھسیٹتا ہوا چند قدم دور لے گیا۔ سلمیٰ نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ آنکھیں کھولیں۔ اژدہا شکار کو جاتا ہوا دیکھ کر پھنکارتا ہوا لپکا۔ اتنی دیر میں ابوالحسن نیام سے تلوار نکال چکا تھا۔ اژدہے نے اس کے بالکل قریب پہنچ کر گردن بلند کی۔ ابوالحسن نے ایک طرف کود کر وار کیا، اژدہے کا سر کٹ کر علیحدہ ہو گیا۔ ابوالحسن نے ندی کے پانی سے تلوار صاف کرتے ہوئے کہا "تم بہت بیوقوف ہو! سونے کی یہ کون سی جگہ تھی؟"

سلمیٰ ابھی تک دہشت زدہ ہو کر کانپ رہی تھی۔ وہ بولی "میں تھک کر یہاں بیٹھ گئی تھی اور اونگھتے اونگھتے نہ جانے کس وقت لیٹ کر سو گئی۔ میں یہاں کئی بار آچکی ہوں لیکن ایسا اژدہا کبھی نہیں دیکھا۔ آپ پہنچ گئے، ورنہ یہ اژدہا اس طرح تڑپنے کی بجائے مجھے نگل رہا ہوتا۔ آپ یہاں کیسے پہنچے؟"

"تم جانتی ہو میں یہاں کیسے پہنچا ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے یہاں پہنچ کر گھوڑا کیوں چھوڑ

دیا تھا؟"

سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں نے کب چھوڑا۔ وہ مجھے گرا کر بھاگ گیا تھا۔"

ابوالحسن نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری تربیت بہت ناقص ماحول میں ہوئی ہے۔ اس لیے تمھارے اخلاق کا معیار وہی ہونا چاہیے جو زمانہ جاہلیت کے عربوں کا تھا لیکن وہ بھی ہزار برائیوں کے باوجود مہمان سے جھوٹ بولنا ایک گھناؤنا فعل خیال کرتے تھے اور اس گھوڑے کو خالی واپس آتا دیکھ کر مجھے یہ یقین نہ آتا تھا کہ یہ تمھیں گرا کر بھاگ آیا ہے۔ اس کی تربیت میرے اصطبل میں ہوئی ہے۔ یہ سرکش اور مغرور ضرور ہے لیکن دھوکا دینا نہیں جانتا۔ سچ بتاؤ! تم نے اپنے ہاتھوں سے اس کی لگام نہیں اتاری اور اسے ڈرا دھمکا کر واپس نہیں بھیجا؟"

سلمیٰ نے آنکھیں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر آپ برا مانتے ہیں تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گی۔"

"تم میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جنھیں میں برا سمجھتا ہوں۔ جنھیں ہر مسلمان برا جانے گا۔"

"آپ چاہیں تو میں ہر عادت بدلنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کی خوشنودی میرا فرض ہے اور آپ نے تو آج میری جان بھی بچائی ہے۔"

"تمھیں مجھے خوش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں چاہتا ہوں تمھارا خدا تم سے خوش ہو۔ تمھیں صرف وہ چیز پسند کرنی چاہیے جو اسے پسند ہو اور ہر اس چیز کو ناپسند کرنا چاہیے جو اسے ناپسند ہو۔ خدا کو عورتوں کا نیم عریاں لباس میں مردوں کے سامنے جانا پسند نہیں۔"

سلمیٰ نے جواب دیا۔ "لباس تو میں نے آپ کے کہنے سے تبدیل کر لیا تھا؟"

ابوالحسن نے کہا۔ "لباس سے زیادہ دل کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ خیر اب باتوں کا وقت نہیں۔ شام ہو رہی ہے۔ تمھارے والد بہت پریشان ہوں گے۔ وہ گھوڑے کے

پہنچنے سے پہلے ہی تمھاری تلاش میں نکل گئے تھے۔

چاندنی رات میں ابوالحسن اور سلمیٰ جنگل کو عبور کر رہے تھے۔ سلمیٰ گھوڑے پر سوار تھی۔ ابوالحسن باگ تھامے آگے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں سلمیٰ نے ابوالحسن کے بحری سفر، اس کے خاندان اور اس کے ساتھیوں کے متعلق سوالات کیے لیکن اس کی توقع کے خلاف ابوالحسن کی بے اعتنائی بڑھتی گئی۔ سلمیٰ پریشان بھی تھی اور نادم بھی، بالآخر اس نے کہا۔ "آپ کو میری وجہ سے بہت تکلیف ہوئی، میں معافی چاہتی ہوں۔ آپ مجھے سزا دے لیں لیکن خفا نہ ہوں، یہ میرا قصور تھا اور مجھے پیدل چلنا چاہیے تھا۔ میں اتر آتی ہوں۔ آپ گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔"

اس دفعہ بھی اس کی توقع کے خلاف ابوالحسن نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "اگر مجھے اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ تم ایک عورت ہو اور کوئی درندہ تمھیں کھا جائے گا تو میں یقیناً اس وقت تمھارے ساتھ چلنا گوارا نہ کرتا۔"

سلمیٰ شکست خوردہ سی ہو کر تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر بولی۔ "اگر وہ اژدہا مجھے نگل جاتا تو آپ کو اس بات کا افسوس ہوتا؟"

"یہ صرف تمھارے لیے ہی نہیں۔ میرے سامنے اگر وہ کسی کو بھی ہلاک کرتا تو مجھے اسی قدر افسوس ہوتا؟"

"آپ نے میرے لیے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی؟"

"ایک انسان کی جان بچانا مسلمان کا فرض ہے۔"

سلمیٰ دیر تک خاموش رہی۔ دور سے چند گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور ابوالحسن نے کہا۔ "دیکھو! وہ ابھی تک تمھیں ڈھونڈ رہے ہیں!"

تھوڑی دیر بعد عبدالشمس اور اس کے ساتھی پہنچ گئے۔ بیٹی کو سلامت دیکھ کر عبدالشمس نے واقعات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ سلمیٰ کی زبانی اژدہے

کے متعلق سُن کر اس نے ابوالحسن کا شکریہ ادا کیا:

(۵)

اگلے روز علی الصباح عبدالشمس اپنے مکان کی چھت پر نیم خوابی کی حالت میں لیٹے لیٹے اذان کی دلکش آواز سُن رہا تھا۔ کچھ دیر انگڑائیاں لینے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ سلمٰی ابھی تک گہری نیند سو رہی تھی۔ عبدُالشمس اسے جگا کر صبح کی ہوا خوری کے ارادے سے نیچے اُتر آیا۔

ابوالحسن کے ساتھی شبنم آلود گھاس پر چادریں بچھا کر اس کے پیچھے صف بستہ کھڑے تھے۔ ابوالحسن نے نہایت دلکش آواز میں سورۂ فاتحہ کے بعد چند آیات تلاوت کیں۔ قرآن مجید کے الفاظ نے عبدُالشمس کے دل میں تلاطم بپا کر دیا۔ اس کے پڑوسی عرب بھی اس کے قریب آ کھڑے ہوئے اور اپنی قوم کے نوجوانوں کے نئے طریقِ عبادت کو دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ رکوع و سجود کے بعد دوسری رکعت تک عبدالشمس پر ایک بے خودی سی طاری ہو چکی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ نمازیوں کی طرف چند قدم اُٹھائے قریب پہنچ کر جھجکا، رُکا اور جذبات کے ہیجان کی کسی رَو کے ماتحت بھاگتا ہوا صف میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔ نماز کے اختتام پر ابوالحسن نے اُٹھ کر عبدُالشمس کو گلے لگا لیا۔ عبدُالشمس کی آنکھوں میں مسرّت کے آنسو چھلک رہے تھے۔ ابوالحسن اور اس کے ساتھیوں نے انھیں مُبارک باد دی:

عبدالشمس نے کہا۔ ”آپ کی زبان میں ایک جادُو تھا۔ مجھے کچھ اور سُنائیے!“

ابوالحسن نے جواب دیا۔ ”یہ میری آواز نہ تھی۔ یہ خدا کا کلام تھا۔“

عبدالشمس نے کہا۔ ”بے شک یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ سُنائیے مجھے!“

ابوالحسن نے اپنے ایک ساتھی طلحہ کی طرف اشارہ کیا۔ طلحہ قرآن کا حافظ تھا۔ عرب اس کے اردگرد بیٹھ گئے۔ طلحہ نے سورۃ یٰسین کی تلاوت کی۔ قرآن مجید کے مقدّس

الفاظ اور طلحہ کی دل گداز آواز سے عبدالشمس اور اس کے ساتھیوں پر رقّت طاری ہو گئی۔ تلاوت کے بعد ابوالحسن نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور اسلام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں اسلام کی دعوت دی۔ عبدُالشمس اور اس کے ساتھی جو ایک مُدّت سے عربوں کی عظمت کی داستانیں سُن کر رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت کا اِعتراف کر چکے تھے۔ ابوالحسن کی تبلیغ کے بعد دینِ اسلام کی صداقت پر ایمان لے آئے۔ کلمۂ توحید پڑھنے کے بعد عبدُالشمس نے اپنے لیے عبداللہ کا نام پسند کیا۔

سلمٰی ناریل کے ایک درخت کا سہارا لیے کھڑی یہ تمام واقعات دیکھ رہی تھی۔ وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی اور اپنے باپ سے کہنے لگی۔

”اباجان! کیا عورتیں بھی مسلمان ہو سکتی ہیں؟“

عبُداللہ نے مُسکراتے ہوئے ابوالحسن کی طرف دیکھا اور وہ بولا۔ ”خدا کی رحمت عورتوں اور مردوں کے لیے یکساں ہے۔“

سلمٰی نے کہا۔ ”تو میرا نام بھی تبدیل کر دیجیے! میں بھی مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔“

ابوالحسن نے کہا۔ ”تمھارا یہی نام ٹھیک ہے۔ تم فقط کلمہ پڑھ لو!“

سلمٰی نے کلمہ پڑھا اور سب نے ہاتھ اُٹھا کر اس کے لیے دُعا کی۔

آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ اچانک موسلا دھار بارش ہونے لگی اور یہ لوگ ایک کمرے میں چلے آئے۔

تھوڑی دیر بعد بارش تھم گئی اور دلیپ سنگھ نے آ کر خبر دی کہ مہاراج آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

ابوالحسن اپنے ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر دلیپ سنگھ کے ساتھ ہو لیا:

(۶)

دوپہر کے وقت ابوالحسن واپس آیا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ راجہ اور بعض سرداروں نے اور بھی عربی گھوڑے خریدنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس لیے ہمارا جہاز چوتھے روز واپس روانہ ہو جائے گا۔"

عبداللہ (عبدالشمس) نے انھیں کچھ دن اور ٹھہرنے کے لیے کہا لیکن ابوالحسن نے جلد واپس آنے کا وعدہ کرکے اجازت حاصل کر لی۔

عبداللہ نے کہا "ابھی ہمیں اسلام کے متعلق بہت کچھ جاننا ہے۔ اگر آپ طلحہ کو یہاں چھوڑ جائیں تو بہت اچھا ہوگا۔"

ابوالحسن نے طلحہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "اگر یہ پسند کریں تو میں انھیں بخوشی یہاں چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔"

طلحہ نے یہ دعوت خوشی سے قبول کر لی۔

اگلے دن ابوالحسن کے ساتھی جہاز کے بادبانوں کی مرمت اور خورد و نوش کا ضروری سامان خریدنے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ دلیپ سنگھ اور عبداللہ سے مشورہ کرنے کے بعد ابوالحسن نے اپنے تمام سرمائے سے آٹھ ہاتھی اور باقی جہاز ناریل سے بھر لیا۔

شام کے وقت ابوالحسن عبداللہ کے باغیچے میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ پیچھے سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو سلمیٰ کھڑی تھی۔ وہ چہرہ جو دو دن پہلے مسرتوں کا گہوارہ تھا۔ اب حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں جو اندھیری رات کے ستاروں سے زیادہ دلفریب اور چمکیلی تھیں، اب پُرنم تھیں۔

اس نے قدرے بے اعتنائی سے پوچھا "سلمیٰ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

ابوالحسن کا رُوکھا پن دیکھ کر ضبط کی کوشش کے باوجود اس کے آنسو چھلک

پڑے۔ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے درد کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔ "آپ پرسوں جا رہے ہیں؟"

"ہاں! لیکن تمھیں کیا ہوا؟ تم رو کیوں رہی ہو؟"

"کچھ نہیں! کچھ بھی تو نہیں!"

آنسوؤں میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ ابوالحسن کے دل پر اثر کیے بغیر نہ رہی۔ اس نے کہا "سلمیٰ! تم ابھی تک وہی ہو۔ اسلام قبول کرنے کے باوجود میں تم میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھتا۔ تمھیں اب نامحرموں کے سامنے آنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ایک مسلمان لڑکی کا سب سے بڑا زیور حیا ہے۔"

"آپ اب تک مجھ سے خفا ہیں۔ آپ کے کہنے پر میں لباس تبدیل کر چکی ہوں، نماز پڑھ چکی ہوں۔ پرسوں سے میں نے گھر کے باہر پاؤں نہیں رکھا۔ کیا یہ بھی ضروری ہے کہ میں ایک مسلمان کے سامنے بھی نہ آؤں؟"

"ہاں! یہ بھی ضروری ہے۔ میں طلحہ کو یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ وہ تمھیں ایک مسلمان عورت کے فرائض سے آگاہ کرے گا۔ تمھیں اسلام کی صحیح تعلیم دے گا۔"

سلمیٰ نے جواب دیا "مجھے کسی اور تعلیم کی ضرورت نہیں۔ آپ جو حکم دیں گے، میں مانوں گی۔ آپ کے اشارے پر میں پہاڑ پر سے کودنے اور ہاتھ پاؤں باندھ کر سمندر میں چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہوں۔"

ابوالحسن نے کہا "سلمیٰ! اگر تمھیں میری خوشی اس قدر عزیز ہے تو سنو! میں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا کہ تم سر سے پاؤں تک اسلام کے سانچے میں ڈھل جاؤ۔ سچے مسلمان کی ہر نیت اور ہر فعل کو کسی انسان کی خوشی نہیں بلکہ خدا کی خوشی کا طلبگار ہونا چاہیے۔ کلمہ پڑھنے کے بعد تم ایک ایسی دنیا میں پاؤں رکھ چکی ہو، جو ایک لامتناہی جدوجہد کا گھر ہے۔ اس میدان میں کودنے والے کے دل میں آنسوؤں اور آہوں کے لیے

کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ مسلمان کے لیے زندگی ایک بہت بڑا امتحان ہے۔ اس کے پہلو میں وہ دل ہونا چاہیے جو خدا کی راہ میں زندگی کی بلند ترین خواہشات کو بھی قربان کرنے سے نہ گھبرائے۔ اس کا سینہ تیروں سے چھلنی ہو لیکن زبان سے آہ تک نہ نکلے۔ تم عرب جاؤ تو شاید یہ دیکھ کر حیران ہو گی کہ مسلمان عورتیں اپنے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کو جہاد پر رخصت کرتی ہیں لیکن ان کی آنکھ میں آنسو تو درکنار، پیشانی پر شکن تک نہیں آتی اور یہ صرف اس لیے کہ وہ خدا کی خوشی کو دنیا کی ہر خوشی پر ترجیح دیتی ہیں۔

اگر تم نے مجھے خوش کرنے کے لیے اسلام قبول کیا ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑے گا کہ تم اسلام کو سمجھی نہیں۔ اگر خدا کو خوش کرنا چاہتی ہو تو گھر جاؤ میں طلحہ کو بھیجتا ہوں، وہ آج ہی تمہیں قرآن پڑھانا شروع کر دے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب میں واپس آؤں تو تم میری پیراکی کا امتحان لینے کے لیے ساحل سے ایک میل کے فاصلے پر سمندر میں میرا استقبال نہ کرو اور مجھے جنگلوں اور پہاڑوں میں تمہیں تلاش نہ کرنا پڑے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو گی کہ عبدالشمس کا نام تبدیل ہونے کے بعد اس کے گھر کا نقشہ بھی بدل چکا ہے اور اس چار دیواری میں ایک مسلمان لڑکی پرورش پا رہی ہے۔"

سلمیٰ نے پرامید ہو کر پوچھا۔ "آپ کب آئیں گے؟"

"میں دن معین نہیں کر سکتا لیکن ارادہ یہی ہے کہ گھوڑے خریدتے ہی وہاں سے واپس آجاؤں لیکن اگر مجھے جہاد کے لیے کہیں جانا پڑا تو ممکن ہے کہ دوبارہ نہ آسکوں۔"

سلمیٰ کے چہرے پر پھر ایک بار اداسی چھا گئی اور اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ "نہیں، یوں نہ کہیے! خدا آپ کو واپس ضرور لائے گا۔"

"تم دعا کرتی رہو گی تو انشاءاللہ میں ضرور آؤں گا۔"

سلمیٰ نے کہا۔ "دعا؟ آپ کیا کہتے ہیں اگر میری دعا قبول ہو سکتی تو آپ جانے کا ارادہ کیوں کرتے؟"

ابوالحسن نے اچانک محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ باتیں کر چکا ہے۔ اس نے لہجے کو ذرا ترش بناتے ہوئے کہا۔ "سلمیٰ جاؤ! اگر عرب کی تمام عورتیں تمہارے جیسی نیک دعائیں کرتیں تو اسلام کی روشنی عرب کی حدود سے باہر نہ نکلتی۔"

سلمیٰ نادم سی ہو کر واپس ہوئی۔ بار بار اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ "میں بہت بے وقوف ہوں۔ میں نے یہ کیوں کہا۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ کوٹھے پر چڑھی۔ افق مغرب پر گرم لوہے کے سرخ تھال کی طرح چمکتا ہوا سورج پانی میں غوطہ لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں ہلکے ہلکے بادل شفق کی سرخی کی عکاسی کر رہے تھے۔ مرطوب ہوا کے جھونکے ناریل کے پتوں پر ایک دلکش راگ چھیڑ رہے تھے۔ اردگرد کے تمام مناظر سے ہٹ کر سلمیٰ کی نگاہیں سمندر کے کنارے عربوں کے جہاز پر مرکوز ہو گئیں۔ دل میں ہیجان بپا ہوا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ "اے خشکی اور تری کے مالک! مجھے ایک مسلمان عورت کا ایمان دے۔ مجھے سیدھی راہ دکھا اور جب وہ واپس آئیں تو مجھے دیکھ کر خفا نہ ہوں۔"

(۷)

تیسرے دن آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ سلمیٰ کوٹھے پر چڑھ کر حسرت بھری نگاہوں سے سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ساحل سے دور ابوالحسن کا جہاز موجوں پر رقص کرتا نظر آرہا تھا۔ ہوا کے چند تیز جھونکے آئے اور بارش ہونے لگی۔ بارش کی تیزی کے ساتھ اس کی نگاہوں کا دائرہ محدود ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جہاز آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ضبط کی کوشش کے باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور رخساروں پر بہتے ہوئے بارش کے قطروں کے ساتھ مل گئے۔ سلمیٰ دیر تک ہاتھ اٹھا کر یہ دعا دہراتی رہی۔ "میرے مولیٰ! اسے سمندر کی سرکش لہروں سے محفوظ رکھیو!"

باغیچے میں ابوالحسن سے آخری ملاقات کے بعد سلمیٰ کے خیالات اور عادات میں

بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ اُسے ابوالحسن کی بے اعتنائی کا بے حد ملال تھا۔ تاہم اُسے انسانیت کا بلند ترین معیار تصوّر کرتے ہوئے وہ اس بات پر ایمان لاچکی تھی کہ اس کی جو عادت ابوالحسن کو ناپسند ہے۔ یقیناً بُری ہوگی۔ چنانچہ اس نے دوبارہ کسی کے سامنے بے حجاب ہونے کی جرأت نہ کی۔

جب ابوالحسن اور اس کے ساتھی بندرگاہ کی طرف روانہ ہوئے تو اس نے اپنے دل سے یہ سوال کیا "کیا اس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ ہوسکتی ہے؟" ابوالحسن کی باتیں یاد آتیں تو اس کے دل میں کبھی یاس کی تاریکیاں مسلط ہوجاتیں اور کبھی اُمید کے چراغ چمک اُٹھتے۔

عبداللہ کی آواز سُن کر وہ نیچے اتری۔ بوڑھے باپ نے سوال کیا "سلمیٰ! تم بارش میں اوپر کیا کر رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں ابا جی! میں ....." سلمیٰ کوئی بہانہ کرنا چاہتی تھی لیکن اسے ابوالحسن کی نصیحت یاد آگئی اور وہ بولی "میں ان کا جہاز دیکھ رہی تھی۔"

عبداللہ نے کہا "وہ تو دیر ہوئی جاچکے۔ جاؤ تم کپڑے بدل آؤ! طلحہ ابھی آجائے گا۔ ہم اس سے قرآن مجید پڑھیں گے۔"

سلمیٰ نے پوچھا "آپ انھیں کہاں چھوڑ آئے؟"

"وہ راستے میں زید کے گھر ٹھہر گیا تھا۔ ابھی آجائے گا۔"

چند دنوں میں طلحہ کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلمیٰ اپنی ہر بات میں ابوالحسن کی خوشی کو مقدم سمجھنے کی بجائے خدا کی رضا کو مقدم سمجھنے لگی۔ تاہم ہر نماز کے بعد اس کی سب سے پہلی دُعا ابوالحسن کے لیے ہوتی تھی۔

چھ مہینے گزر گئے ابوالحسن کی کوئی خبر نہ آئی۔ سلمیٰ کی اُداسی بے چینی میں تبدیل ہونے لگی۔ وہ صبح و شام مکان کی چھت پر چڑھ کر سمندر کی طرف دیکھتی۔ بندرگاہ کی طرف آنے

والا ہر نیا جہاز اُسے دور سے ابوالحسن کی آمد کا پیغام دیتا۔ وہ اپنے خادم کو دن میں کئی کئی بار بندرگاہ کی طرف بھیجتی۔ جب وہ مایوس نگاہوں کے ساتھ واپس آتا تو وہ بے قرار سی ہوکر پوچھتی "تم نے اچھی طرح دیکھا۔ ممکن ہے ان میں کوئی عرب بھی ہو؟"

خادم جواب دیتا "وہ فلاں جگہ سے آیا ہے۔ میں پوری طرح چھان بین کرکے آیا ہوں ان میں ایک بھی عرب نہ تھا۔"

وہ امید و بیم کے سمندر میں غوطے کھانے والے انسان کی طرح تنکوں کا سہارا لیتی اور کہتی "تم نے ملّاحوں سے پوچھا ہوتا۔ ممکن ہے انھوں نے راستے میں کسی بندرگاہ پر عربوں کا جہاز دیکھا ہو یا ان کے متعلق سُنا ہو؟"

خادم پھر بھاگتا ہوا بندرگاہ جاتا۔ سلمیٰ کی اُمنگیں پُرانی اُمیدوں کے کھنڈروں پر نئی امیدوں کا محل کھڑا کر لیتیں۔ بوڑھے نوکر کا افسردہ اور ملول چہرہ پھر وہی حوصلہ شکن خبر دیتا اور سلمیٰ کی امیدوں کا محل دھڑام سے نیچے آرہتا۔ ہر صبح وہ اپنے دل میں امید کے چراغ روشن کرتی۔ جب سورج سمندر کی لہروں میں چھُپ جاتا تو یہ چراغ بھی بجھ جاتے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں آہوں اور آنسوؤں میں تبدیل ہوجاتیں۔

مدّت تک طلحہ یا اپنے باپ میں سے کسی پر اس نے اپنے دل کا حال ظاہر نہ ہونے دیا لیکن ایک شام سلمیٰ کے طرزِ عمل نے ان دونوں کو شبہ میں ڈال دیا۔ باہر موسلادھار بارش ہو رہی تھی، طلحہ اور عبدُاللہ برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سلمیٰ ایک کمرے کے دریچے کے سامنے بارش کا منظر دیکھ رہی تھی۔ باتوں باتوں میں ابوالحسن کا ذکر آگیا۔ عبداللہ نے کہا "خدا جانے وہ اب تک کیوں نہیں آئے۔ آٹھ مہینے ہوگئے ہیں۔"

طلحہ نے کہا "اگر خدا نے اُسے سمندر کے حوادث سے محفوظ رکھا ہو تو اتنی دیر تک اس کے واپس نہ آنے کی وجہ یہی ہے کہ وہ کہیں جہاد پر چلا گیا ہے۔"

عبداللہ نے کہا "آج مجھے دلیپ سنگھ نے بتایا ہے کہ یہاں سے کوئی تیس میل

کے فاصلے پر مالابار کا ایک جہاز غرق ہو چکا ہے۔ صرف ایک کشتی پانچ آدمیوں کو لے کر یہاں پہنچی ہے۔"

طلحہ نے پوچھا۔" اس پر کتنے آدمی تھے؟"

"شاید بیس تھے۔ جہاز بہت بڑا تھا اور اس پر تجارت کا بہت سامان تھا۔"

"جہاز کیسے غرق ہوا؟"

"ملاح منزل کو قریب دیکھ کر بے پرواہ ہو گئے اور جہاز ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔"

سلمیٰ پاس کے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنے خیالات میں محو تھی۔ اس نے فقط آخری فقرہ سنا اور ایک ثانیہ کے لیے اس کی رگوں میں خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ برآمدے سے پھر عبداللہ کی آواز آئی۔" یہ چٹانیں بہت خطرناک ہیں۔ ہر سال ان کی وجہ سے کوئی نہ کوئی جہاز غرق ہو جاتا ہے۔ یہاں کے باشندوں کا خیال ہے کہ یہ چٹانیں سمندر کے دیوتا کے مندر ہیں۔"

یہ سنتے ہی سلمیٰ کی رگوں میں ایک غیر معمولی ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ اٹھی اور اپنے کمرے سے نکل کر باپ کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کا دہشت زدہ چہرہ اور پتھرائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر باپ نے پوچھا۔" بیٹی! تمہیں کیا ہوا؟"

کچھ دیر جذبات کی شدّت کی وجہ سے سلمیٰ کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ رنج و کرب کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی نگاہیں یہ کہہ رہی تھیں۔" جو کچھ تم مجھ سے چھپانا چاہتے ہو میں سُن چکی ہوں۔"

طلحہ نے حیران ہو کر پوچھا۔" کیوں بیٹی کیا بات ہے؟"

سلمیٰ کے بھنچے ہوئے ہونٹ کپکپائے۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں پر آنسوؤں کے باریک پردے چھا گئے۔ اس نے کہا۔" بتایئے! کب ڈوبا اُن کا جہاز ____؟ آپ کو

کس نے بتایا؟ اور وہ ....! آپ خاموش کیوں ہیں؟ خدا کے لیے کچھ کہیے! میں بُری سے بُری خبر سننے کے لیے تیار ہوں۔" ہچکیوں اور آہوں کی شدّت اس کی آواز کے تسلسل کو توڑ رہی تھی۔

عبداللہ نے پریشان سا ہو کر جواب دیا۔" بیٹی! ہم مالابار کے ایک جہاز کا ذکر کر رہے تھے۔ آج دلیپ نے مجھے بتایا تھا۔"

لیکن سلمیٰ نے باپ کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا۔" نہیں نہیں! آپ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ مجھے جھوٹی تسلیاں نہ دیں!" یہ کہہ کر سلمیٰ ہچکیاں لیتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

بوڑھا باپ کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ وہ طلحہ کی طرف معذرت طلب نگاہوں سے دیکھتا ہوا اُٹھا اور سلمیٰ کے کمرے میں چلا گیا۔ سلمیٰ منہ کے بل بستر پر لیٹی ہچکیاں لے رہی تھی۔ بوڑھے باپ کا دل بھر آیا اور اس نے قریب بیٹھ کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی کیا ہو گیا تمہیں؟"

سلمیٰ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنسو پونچھے اور ہچکیاں ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔" کچھ نہیں ابّاجان مجھے معاف کیجیے! آئندہ آپ مجھے کبھی روتے نہیں دیکھیں گے۔"

"لیکن رونے کی کوئی وجہ بھی تو ہو؟ ایسی خبریں تو ہم روز سُنا کرتے ہیں۔ آخر مالابار کا ایک جہاز غرق ہو جانے کی خبر میں کیا خصوصیت تھی؟"

سلمیٰ نے غور سے اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا اور قدرے مطمئن ہو کر بولی۔ "آپ سچ کہتے ہیں؟"

عبداللہ نے برہم ہو کر کہا۔" آخر مجھے جھوٹ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ آج تک تم نے میری کسی بات پر شک نہیں کیا۔ اگر مجھ پر یقین نہیں آتا تو طلحہ سے پوچھ لو!"

سلمیٰ نے ندامت سے سر جھکا لیا اور کہا۔" ابّاجان! میں معذرت چاہتی ہوں،

میں سمجھی تھی .... کہ شاید آپ عربوں کے جہاز کا ذکر کر رہے تھے۔"

"بیٹی! کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ خدانخواستہ اگر میں ان کے جہاز کے متعلق ایسی خبر سُنتا تو مجھے تم سے کم صدمہ ہوتا؟"

شام کے کھانے کے بعد طلحہ اور عبداللہ کا خادم عشاء کی نماز ادا کر رہے تھے۔ خادمہ برتن صاف کر رہی تھی۔ اتنے میں کسی نے باہر کے پھاٹک پر دستک دی، سلمیٰ نے خادمہ سے کہا۔" شاید زید اور قیس آئے ہیں۔ تم نے باہر کا دروازہ بند تو نہیں کر دیا تھا؟"

خادمہ نے جواب دیا۔" ایسی بارش میں کون آسکتا ہے۔ میں ابھی کواڑ بند کر کے آئی ہوں۔ اگر انھیں آنا ہوتا تو مغرب کی نماز کے لیے نہ آتے؟ اور ہاں زید تو بیمار ہے، قیس بے چارہ بوڑھا۔ اس نے گھر ہی پر نماز پڑھ لی ہوگی۔"

"لیکن پھر بھی کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔"

"یہ آپ کا وہم ہے۔ دروازہ ہوا سے ہل رہا ہے۔"

"نہیں کسی کی آواز بھی سُن رہی ہوں۔ شاید...... ! میں جاتی ہوں۔"

سلمیٰ کا دل دھڑک رہا تھا۔ تاریکی میں ایک قدم آگے دیکھنا محال تھا۔ وہ بجلی کی چمک میں درختوں سے بچتی ہوئی پھاٹک تک پہنچی۔

پھاٹک کے باہر کوئی آہٹ نہ پاکر اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ مایوس ہو کر واپس ہونے کو تھی کہ کسی نے دروازے کو زور سے دھکا دیتے ہوئے آواز دی۔" کوئی ہے؟"

ایک آن کے لیے سلمیٰ کے پاؤں زمین سے پیوست ہو کر رہ گئے۔ پھر وہ لپک کر آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ سلمیٰ کے سامنے ایک بلند قامت انسان کھڑا تھا۔

دروازہ کھلتے ہی اس نے سوال کیا۔" کیا یہ عبداللہ کا گھر ہے؟"

پیشتر اس کے کہ سلمیٰ کوئی جواب دیتی، بجلی چمکی اور ابوالحسن سلمیٰ کو پہچان کر اندر

داخل ہوا۔

ابوالحسن نے کہا۔" او ہو تم! مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میری وجہ سے تمھیں بارش میں بھیگنا پڑا۔"

سلمیٰ نے اپنے دل میں کہا۔" کاش تم یہ جان سکتے کہ اس بارش کی بوندیں کس قدر خوش گوار ہیں۔" اور پھر ابوالحسن سے مخاطب ہو کر بولی۔" چلیے!"

برآمدے میں طلحہ اور عبداللہ ابوالحسن کی آواز سُن کر اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ عبداللہ نے آواز دی:

"کون! ابوالحسن!!"

ابوالحسن نے برآمدے کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔" جی ہاں! میں ہی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے خواہ مخواہ اس وقت آپ کو تکلیف دی۔"

طلحہ نے پوچھا۔" کہیے خیریت تو ہے نا! آپ کے ساتھی کہاں ہیں؟"

"ہاں! خیریت ہے۔ میں ان سب کو جہاز پر چھوڑ آیا ہوں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے اتنے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ راستے میں ایک دفعہ پھسلا دو مرتبہ ندی میں گرا، پانچ مکانات کو آپ کا مکان سمجھ کر آوازیں دیں۔ ایک گھر کے چند فرض شناس کتوں نے میرا استقبال کیا۔"

عبداللہ نے سلمیٰ کو آواز دی۔ سلمیٰ ابھی بے خودی کے عالم میں برآمدے سے باہر کھڑی تھی۔

آج بھی بارش کے قطرے اس کے رُخساروں کے آنسو دھو رہے تھے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ باپ کی آواز سُن کر وہ چونکی اور بھاگتی ہوئی برآمدے میں داخل ہوئی۔

"کیا ہے ابا جان؟"

"بیٹی جاؤ! ان کے لیے کھانا اور کپڑوں کا جوڑا لے آؤ اور باقی مہمانوں کے لیے

بھی کھانا تیار کراؤ! میں انھیں بلانے کے لیے جاتا ہوں۔"

ابوالحسن نے کہا۔ "کھانا ہم سب کھا چکے ہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔"

کپڑے بدلنے کے بعد ابوالحسن، عبداللہ اور طلحہ سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس نے دیر سے واپس آنے کی یہ وجہ بیان کی کہ بصرہ سے اُسے افریقہ ایک مہم میں شریک ہونے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔

ساتویں دن عبداللہ کی رضامندی نے سلمیٰ اور ابوالحسن کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا۔

(۸)

تین سال بعد ابوالحسن شہر میں اپنے لیے ایک خوبصورت مکان اور اس کے قریب ایک مسجد تعمیر کروا چکا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی اس کے چند ساتھی بھی اس شہر میں آباد ہو گئے۔ پانچ سال کے عرصے میں ابوالحسن اور طلحہ کی تبلیغ سے مقامی باشندوں کے چند گھرانے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور ابوالحسن نے مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کر کے درس و تدریس کے فرائض طلحہ کے سپرد کر دیے۔

عبداللہ کی بدولت اس کی تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ شادی کے دوسرے سال اس کے ہاں ایک لڑکا اور چوتھے سال ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکے کا نام اُس نے خالد اور لڑکی کا نام ناہید رکھا۔ دسویں سال ایک اور لڑکا پیدا ہوا لیکن تین ماہ کی عمر میں والدین کو داغ مفارقت دے گیا۔

جب خالد کی عمر سات اور ناہید کی عمر پانچ برس تھی۔ سلمیٰ کے باپ نے چند دن موسمی بخار میں مبتلا رہ کر داعئ اجل کو لبیک کہا۔

ابوالحسن کو دنیا کی ہر نعمت میسّر تھی۔ اس کے پاس مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ اُسے اپنے بیوی بچوں سے بے انتہا محبّت تھی لیکن یہ محبّت اُسے گھر کی چار دیواری میں پابندِ سلاسل نہ رکھ سکی۔ وہ قریباً ہر سال فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے ایک طویل بحری سفر کی کٹھن منازل طے کرتا۔ پانچ دفعہ اس نے ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ میں جہاد کرنے والی افواج کا ساتھ دیا۔

ہر بار جہاد اور حج سے واپس آنے کے بعد وہ فنونِ حرب اور مذہبی تعلیم میں اپنے بچوں کا امتحان لیتا۔ خالد تیراندازی، شاہسواری، تیغ زنی اور جہاز رانی کی تعلیم میں اپنے باپ کی بہترین توقعات پوری کر رہا تھا۔

ناہید بارہ سال کی عمر تک تیراندازی کے علاوہ سرکش گھوڑوں پر سوار ہونا سیکھ چکی تھی۔ پڑھنے لکھنے میں بھی طلحہ کو اس کی غیر معمولی ذہانت کا اعتراف تھا۔

راجہ کے ساتھ ابوالحسن کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ مہارانی ایک مدّت سے سلمیٰ کی سہیلی بن چکی تھی۔ وہ ہفتے میں ایک دو مرتبہ پالکی بھیج کر ماں اور بیٹی کو اپنے محل میں بُلاتی۔ راجکماری ناہید سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی۔ کہ خود بھی کبھی کبھی ابوالحسن کے گھر چلی آتی۔

راجکمار عمر میں خالد سے چار سال بڑا تھا لیکن پھر بھی وہ خالد کو ہر بات میں قابلِ تقلید سمجھتا۔

ایک دن دلیپ سنگھ نے راجہ کے سامنے فنونِ حرب میں خالد کی غیر معمولی استعداد کی تعریف کی۔ راجہ نے پوچھا "کیا وہ ہمارے راجکمار کا مقابلہ کر سکے گا؟"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ "مہاراج! ہمارے راجکمار نازوں کے پلے ہوئے ہیں اور وہ ایک سپاہی کا بیٹا ہے۔"

"لیکن وہ بہت چھوٹا ہے۔"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔" مہاراج! اگر عرب مائیں بچپن میں اپنے بچّوں کی اس طرح تربیت نہ کرتیں تو آج وہ آدھی دنیا پر قابض نہ ہوتے۔ میں نے سُنا ہے کہ عرب مائیں چودہ سال کے بچوں کو میدانِ جنگ میں بھیج دیتی ہیں۔"

راجہ نے پوچھا۔"خالد کی عمر کیا ہے؟"

" مہاراج! یہی کوئی بارہ سال ہو گی۔"

" آخر ان بچّوں میں کیا خوبی ہے۔ جو ہمارے بچّوں میں نہیں؟"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔" مہاراج! اگر بُرا نہ مانیں تو میں عرض کروں۔"

راجہ نے کہا۔"کہو!"

" مہاراج! ہم میں اور ان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ہم بے شمار دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ ان دیوتاؤں کے علاوہ دنیا کی ہر وہ طاقت جو ہمیں خوفزدہ کر سکتی ہے۔ ہماری نگاہوں میں دیوتا کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ مثلاً ہماری راہ میں اگر کوئی دشوار گزار پہاڑ آجائے تو ہم اپنی قوتِ تسخیر کے امتحان کی بجائے اُسے دیوتا سمجھ کر اس کی پُوجا شروع کر دیتے ہیں لیکن وہ صرف ایک خدا کو مانتے ہیں اور اس کے سوا رُوئے زمین کی کسی بڑی سے بڑی قوّت کے سامنے سر جُھکانا گناہ سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کا ایمان ہے کہ انسان مر کر فنا نہیں ہوتا بلکہ موت کے بعد اس کی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

ابوالحسن نے ایک دن مجھے بتایا تھا کہ جب خالدؓ ان کا بہت بڑا سپہ سالار شام کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا تو شام کے گورنر نے اُسے لکھا تھا کہ تم پہاڑ سے ٹکرا رہے ہو۔ تمہارے چالیس ہزار سپاہیوں کے مقابلے میں میرے پاس اڑھائی لاکھ ایسی فوج ہے جو بہترین ہتھیاروں سے مسلح ہے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں کے سپہ سالار نے لکھا کہ مجھے تمہاری طا لیکن تم شاید یہ نہیں جانتے کہ تمہارے سپاہیوں کے دلوں میں جس قدر زندہ رہنے کی آرزو ہے میرے سپاہیوں میں موت

کی تمنا اس سے کہیں زیادہ ہے۔"

راجہ نے کہا۔" دلیپ سنگھ! میں یہ چاہتا ہوں کہ راجکمار کی سپاہیانہ تربیت ابوالحسن کو سونپ دی جائے۔ تم اس سے ملو۔ اگر وہ یہ خدمت قبول کرے تو ہم اسے ایک معقول معاوضہ دینے کے لیے تیار ہیں۔"

دلیپ سنگھ کے کہنے پر ابوالحسن نے راجہ کی دعوت خوشی سے قبول کر لی لیکن معاوضہ لینے سے انکار کر دیا۔

دو سال کی تربیت کے بعد ابوالحسن نے راجہ سے کہا۔"اب آپ کا بیٹا فنونِ سپہ گری میں اس ملک کے بہترین نوجوانوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔"

راجہ نے پوچھا۔" میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ تیر اندازی اور شاہسواری میں خالد کا مدِمقابل ہے یا نہیں؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔" خالد نے اس عمر میں تیر و کمان سنبھالا تھا۔ جب آپ کا راجکمار کھلونوں سے دل بہلایا کرتا تھا اور اس عمر میں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنا سیکھا تھا جس عمر میں راجکمار کو نوکر کندھوں پر اٹھائے پھرتے تھے۔ خالد فطرتاً ایک سپاہی ہے اور راجکمار فطرتاً ایک شہزادہ ہے۔"

" اور راجکمار تیغ زنی میں کیسا ہے؟"

" وہ خالد سے عُمر میں بڑا ہے، اس کے بازو بھی اسی قدر مضبوط ہیں۔ میں نے دونوں کا مقابلہ کرا کے نہیں دیکھا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ خالد کی نسبت زیادہ آسانی سے تلوار گھما سکتا ہے۔"

راجہ نے بیٹے کو بُلا کر پوچھا۔" کیوں راجکمار! تم اپنے اُستاد کے بیٹے سے تلوار کے دو دو ہاتھ دکھانے کے لیے تیار ہو؟"

راجکمار نے جواب دیا۔" نہیں پتا جی! وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اگر میں ہار گیا

مجھے شرم آئے گی، اور وہ ہار گیا تو بھی مجھے ہی شرم آئے گی۔"

(۹)

ابوالحسن کی شادی کو اٹھارہ برس گزر چکے تھے۔ خالد کی عمر سولہ اور ناہید کی عمر چودہ برس تھی۔ خلیفہ ولید کی مسند نشینی کے ساتھ مسلمانوں کی نئی فتوحات کا آغاز ہو چکا تھا۔

ایک دن سندھی تاجروں کا جہاز آیا۔ ان کے ساتھ عمان کا ایک عیسائی بھی تھا۔ سندھ کے تاجروں نے جزیرے کے عربوں سے ترکستان اور شمالی افریقہ میں مسلمانوں کی شاندار فتوحات کا ذکر کیا۔ عمان کے تاجر نے ان تمام باتوں کی تصدیق کی۔ ابوالحسن اور اس کے چند ساتھی حج کے لیے تیار تھے۔ اب حج کے ارادوں کے ساتھ شوقِ جہاد بھی شامل ہو گیا۔

راجہ باہر سے آنے والے تاجروں کی زبانی نئے ممالک کی خبریں نہایت دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ مسلمانوں کی تازہ فتوحات کی خبریں سن کر اس نے ابوالحسن کو بلایا اور مسلمانوں کے خلیفہ اور عراق کے گورنر کو سونے اور جواہرات کے چند تحائف بھیجنے کی خواہش ظاہر کی۔

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "میں خوشی سے آپ کے تحائف ان کے پاس لے جاؤں گا۔"

سندھ کے تاجروں نے اپنا مال فروخت کیا اور نیا مال خرید کر لوٹ گئے۔ ان کے جانے کے چند دن بعد ابوالحسن اور اس کے ساتھی سفرِ حج کے لیے تیار ہو گئے۔ اس سال سراندیپ کے نو مسلموں کے علاوہ حج پر جانے والے عربوں کی تعداد بھی خلافِ معمول زیادہ تھی۔

طلحہ اور اس کے علاوہ تین اور عرب تاجر حج پر جانے والوں کے گھروں کی دیکھ بھال کے لیے پیچھے رہ گئے۔ بعض عرب اپنے کم سن بچوں کو طلحہ کی حفاظت میں چھوڑ کر بیویوں کو

ساتھ لے گئے اور بعض اپنے اہل و عیال کو گھروں میں چھوڑ گئے۔

ابوالحسن اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لے جانے کا ارادہ کر چکا تھا لیکن سفر سے تین دن قبل سلمیٰ اچانک بیمار ہو گئی اور اسے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

خالد عقاب کے اس بچے کی طرح جو پر نکلنے کے بعد گھونسلے میں پھڑپھڑا رہا ہو، میدانِ عمل میں اپنے سپاہیانہ جوہر دکھانے کے لیے بے قرار تھا لیکن ماں کی علالت نے اسے گھر ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔ ابوالحسن نے وعدہ کیا کہ واپس آتے ہی اسے عرب کی سیاحت کے لیے بھیج دے گا۔

رخصت کے دن سلمیٰ کو سخت بخار تھا لیکن وہ انتہائی تکلیف کے باوجود بستر پر نہ لیٹی۔ شوہر کو الوداع کہنے سے پہلے اس نے سراپا التجا بن کر کہا۔ "دیکھیے! میں بالکل تندرست ہوں۔ مجھے ساتھ لے چلیے۔ اپنے وعدے نہ بھولیے۔"

ابوالحسن نے مغموم سا ہو کر جواب دیا۔ "نہیں سلمیٰ! جہاز پر موسمی بخار تمہیں بہت تکلیف دے گا۔ تم تندرست ہو جاؤ گی تو میں دوسرے سفر میں تمہیں ساتھ لے چلوں گا۔ دیکھو میں تمہاری تیمارداری کے لیے خالد اور ناہید کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ طلحہ بھی تمہارا خیال رکھے گا۔"

اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ "نہیں! نہیں!! مجھے ضرور لے چلیے! میں آپ کے ساتھ ہر تکلیف برداشت کر سکتی ہوں۔"

ابوالحسن نے کہا۔ "سلمیٰ ضد نہ کرو۔ دیکھو تمہاری نبض کس قدر تیز ہے۔ بخار سے تمہارا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ تم نے کبھی سمندر کا سفر نہیں کیا۔ میں جلد واپس آ جاؤں گا۔"

"نہیں! اس دفعہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا سفر بہت لمبا ہے اور میں شاید دیر تک انتظار نہ کر سکوں گی۔"

ابوالحسن نے مغموم صورت بنا کر جواب دیا۔ "سلمیٰ! تم رو رہی ہو کئی برس ہوئے

میں نے تمھیں یہ بتایا تھا کہ مسلمان عورتیں مجاہدوں کو رخصت کرتے وقت آنسو نہیں بہاتیں۔"

ان الفاظ نے سلمیٰ پر جادو کا سا اثر کیا۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "میرے اس درجہ مغموم ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ جا رہے ہیں بلکہ یہ تھی کہ آپ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ اگر ایک بار مجھے میدانِ جہاد میں لے جاتے تو پھر شاید مجھے کمزوری کا طعنہ نہ دیتے۔ میں آپ کے ساتھ تیروں کی بارش میں کھڑی ہو سکتی ہوں لیکن آپ کے انتظار میں ہر روز صبح و شام کوٹھے کی چھت پر چڑھ کر سمندر کی طرف دیکھنا میرے لیے صبر آزما ہوگا۔"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "یہی صبر عورتوں کا جہاد ہے۔ جو کام مرد میدان میں نہیں کر سکتے، وہ عورتیں گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کے کر سکتی ہیں۔ عورتیں خالدؓ اور مثنیٰؓ نہیں بن سکتیں لیکن ان کی ماؤں کا رتبہ حاصل کر سکتی ہیں۔ آج ہمارے سپاہی اپنے گھروں سے کوسوں دور لڑ رہے ہیں اور ان کے عزائم وہ عورتیں بلند رکھتی ہیں جو صبر و استقلال سے گھروں میں ماؤں، بہنوں اور بیویوں کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان پر اعتماد کی بدولت ان کے دل میں یہ خیال بے چینی پیدا نہیں کرتا کہ گھر پر ان کے ننھے بھائیوں اور بچوں کا کیا حال ہوگا۔ سلمیٰ! تم ہی بتاؤ۔ کیا وہ سپاہی جسے یہ خیال ہو کہ اس کی بیوی رو رو کر اندھی ہو گئی ہوگی اور بچے گلیوں میں ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے، ایک بہادر کی طرح مسکرا کر جان دے سکتا ہے؟ فرض کرو، اگر میں نہ آؤں تو عرب کی دوسری ماؤں کی طرح خالد کو جہاد پر رخصت نہ کرو گی؟"

سلمیٰ نے جواب دیا۔ "آپ یقین رکھیے! اگر آپ خالد کے لیے ایک برا باپ بننا گوارا نہیں کرتے تو میں بھی بری ماں بننا پسند نہ کروں گی۔"

شام کے وقت ابوالحسن کا جہاز روانہ ہوا۔ سلمیٰ ناہید کے ساتھ چھت پر کھڑی

سمندر کی طرف دیکھ رہی۔ ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ناہید نے کہا۔ "امی جان! آپ نے ابا جان سے وعدہ کیا تھا کہ آپ ہمارے سامنے آنسو نہ بہائیں گی۔"

سلمیٰ نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "بیٹی! کاش یہ میرے بس کی بات ہوتی، تمھارے باپ کے مقابلے میں میرا دل بہت کمزور ہے۔"

سلمیٰ یہ کہہ کر بیٹھ گئی۔ ناہید نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "امی! آپ کو ابھی تک بخار ہے۔ آپ بستر پر لیٹ جائیں!"

سراندیپ کے دربار میں

مہاراجہ سراندیپ تخت پر رونق افروز تھا۔ تخت سے نیچے دائیں بائیں آبنوس کی کرسیوں پر چند سردار حسبِ مراتب بیٹھے تھے۔ راجہ کے دائیں ہاتھ سب سے پہلی کرسی راج کمار اودھے رام کی تھی۔ راج کمار ایک خوش شکل اور بارعب نوجوان تھا۔ کرسیوں کے پیچھے دو قطاروں میں چند عہدہ دار ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے۔ چوبدار دربار میں داخل ہوا اور رسمی آداب بجالانے کے بعد بولا۔ "مہاراج! دلیپ سنگھ حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔"

راجہ پریشان سا ہوگیا اور بولا۔ "دلیپ سنگھ آگیا! ابوالحسن اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟"

چوبدار نے جواب دیا۔ "مہاراج! ان میں سے اس کے ساتھ کوئی نہیں، ایک عرب نوجوان ہے اور وہ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔"

راجہ نے بے قرار ہو کر کہا۔ "بلاؤ انھیں جلدی کرو۔"

چوبدار کے واپس جانے کے تھوڑی دیر بعد دلیپ سنگھ ایک بیس بائیس سالہ عرب نوجوان کے ہمراہ داخل ہوا۔ دلیپ سنگھ کے ہاتھوں میں چاندی کا ایک طشت تھا جس

میں ایک سونے کی ڈبیا اور ایک خنجر تھا۔ خنجر کے دستے میں بیش قیمت ہیروں کے نگینے جگمگا رہے تھے۔ دلیپ سنگھ دروازے اور تخت کے درمیان مختلف مقامات پر تین بار جھکا۔ پھر آگے بڑھا اور راجہ کے سامنے طشت رکھنے کے بعد ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا لیکن اس دوران میں راجہ، ولی عہد اور باقی حاضرینِ دربار کی نگاہیں زیادہ تر اس کے نوجوان ساتھی پر مرکوز رہیں۔

یہ زمانہ جس سے ہماری داستان تعلق رکھتی ہے، عرب کے صحرا نشینوں کی تاریخ کا سنہری زمانہ تھا۔ اسلامی فتوحات کی سیلابی موجوں کے سامنے اس سے کئی سال قبل کفر کے مضبوط ترین قلعوں کی دیواریں کھوکھلی ہوچکی تھیں اور اب ایک زبردست ریلا انھیں خس و خاشاک کی طرح بہانے لیے جا رہا تھا۔ ترکستان، آرمینیا اور شمالی افریقہ کے میدانوں میں ان کے گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ فتوحات کے سیلاب کی ایک لہر مشرق میں مکران تک پہنچ چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قرب و جوار کے ممالک کے باشندے ہر عرب کے چہرے پر سکندر کا تخت، ارسطو کی سی فراست اور سلیمانؑ کا سا جاہ و جلال دیکھنے کے عادی ہوچکے تھے۔ روئے زمین کی ایک پسماندہ قوم اسلام کی دولت سے مالا مال ہو کر دنیا کی نگاہوں میں وہ بلندی حاصل کرچکی تھی جو آج تک کسی قوم کو نصیب نہیں ہوئی۔

سیلون (سراندیپ) کے راجہ کے دربار میں وہ نوجوان کھڑا تھا جس کے آباؤ اجداد یرموک اور قادسیہ کی جنگوں میں مشرق اور مغرب کی دو عظیم ترین سلطنتوں کی عظمت خاک میں ملا چکے تھے، وہ ان نوجوانوں میں سے تھا جن کی صورت دیکھنے کے بعد کسی کو ان کی سیرت کے متعلق تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ راجہ اور اس کے درباری ایک نظر میں اس کی صورت اور سیرت کی ہزاروں خوبیوں کے معترف ہوچکے تھے۔ وہ بے پروائی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور دیکھنے

والوں کی نگاہیں اس کے جسم کی ہر جنبش میں ایک غایت درجہ کی خود اعتمادی دیکھنے لگیں۔ اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور تمام حاضرین ہمہ تن گوش بن گئے۔ کچھ دیر "السّلام علیکم" کے الفاظ راجہ اور درباریوں کے کانوں میں گونجتے رہتے۔ راجکمار "وعلیکم السّلام" کہہ کر مُسکراتا ہوا اُٹھا اور تمام سردار اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ راجکمار نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور تمام سردار دربار کے آداب کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے باری باری آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرنے لگے۔ راجکمار نے اُسے اپنے قریب بٹھا لیا اور ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس سے باتیں کرنے لگا۔

راجکمار نے پوچھا۔ "آپ کا نام؟"

نووارد نے جواب دیا۔ "زبیر۔"

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"بصرہ سے۔"

"ابوالحسن اور ان کے ساتھیوں کا پتہ چلا؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "نہیں! مجھے ڈر ہے کہ وہ راستے میں کسی حادثے کا شکار ہو چکے ہیں۔"

راجکمار کے چہرے پر پژمُردگی چھا گئی۔

راجہ کچھ دیر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اُسے راجکمار کی باتوں پر خوش ہونا چاہیے یا ناراض، حاضرین تخت کی بجائے اُن دو کرسیوں کی طرف دیکھ رہے تھے جن پر راجکمار اور عرب نوجوان رونق افروز تھے اور راجہ کے لیے یہ نئی بات تھی لیکن اپنے اکلوتے بیٹے کے منہ سے عربی کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سننے کی مسرّت اس تلخی پر غالب آ رہی تھی۔ بالآخر اس نے کہا۔ "ہم آپ کو دیکھ بہت خوش ہوتے ہیں۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "شکریہ! سراندیپ کے راجہ کو ہمارے خلیفہ اور والئ

عراق سلام کہتے ہیں۔"

یہ فقرہ نصف عربی اور نصف سراندیپ کی زبان میں ادا کیا گیا۔ راجہ اور ولی عہد کی مسکراہٹ دیکھ کر تمام درباری ہنس پڑے۔

راجہ نے پوچھا۔ "آپ نے ہماری زبان کہاں سے سیکھی؟"

زبیر نے دلیپ سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ میرے اُستاد ہیں۔"

راجہ اور درباریوں نے دلیپ سنگھ کو پہلی دفعہ توجہ کا مستحق سمجھا۔ راجہ نے کہا۔

"ہاں دلیپ! ابوالحسن کا کچھ پتہ نہیں چلا؟"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ "مہاراج! اس سال ہمارے ملک کا کوئی جہاز عرب کی کسی بندرگاہ تک نہیں پہنچا۔ بصرہ، مکّہ، مدینہ اور دمشق میں ہر جگہ ان میں سے کسی نہ کسی کے رشتہ دار موجود تھے لیکن سب نے یہی بتایا کہ وہ حج پر نہیں پہنچے۔ واپسی پر میں ہر بندرگاہ سے ان کا سُراغ لگاتا آیا ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے ساحل کے قریب ان کا جہاز کسی حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔ مہاراج نے دمشق کے بادشاہ اور عراق کے حاکم کو جو تحائف بھیجے تھے، وہ بھی ان کے پاس نہیں پہنچے، پھر بھی وہ آپ کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ میں اُن کی طرف سے یہ تحائف آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔ اس سونے کی ڈبیا میں ایک ہیرا ہے۔ یہ دمشق کے بادشاہ نے بھیجا ہے اور یہ خنجر عراق کے حاکم نے۔ میں عربی نسل کے آٹھ گھوڑے بھی لایا ہوں چار سفید ہیں جو بادشاہ نے دیے ہیں اور چار مشکی ہیں جو عراق کے حاکم نے بھیجے ہیں۔ انھیں شاہی اصطبل میں پہنچا دیا گیا ہے۔"

راجہ نے جُھک کر ڈبیا اُٹھائی اور کھول کر کچھ دیر چمک دار ہیرا دیکھنے کے بعد خنجر اٹھا کر اس کے دستے کی تعریف کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے دونوں تحفے راجکمار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو راجکمار! یہ تحفہ اس بادشاہ کا ہے جس کا لوہا ہر

لوہے کو کاٹتا ہے۔ جس کی سلطنت میں کئی دریا، کئی پہاڑ اور کئی سمندر ہیں، جس کے سپاہی پتھر کے قلعوں کو مٹی کے گھروندے سمجھتے ہیں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر دریاؤں کو عبور کرتے ہیں اور یہ خنجر مجھے عراق کے حاکم نے بھیجا ہے جس کے نام سے بڑے بڑے بادشاہ کانپتے ہیں۔"

راجکمار کسی اور خیال میں تھا۔ اس نے یہ دونوں چیزیں بے پروائی سے دیکھیں اور وزیر کے ہاتھوں میں تھما دیں۔ یہ تحائف جنھیں سراندیپ کا سادہ دل راجہ روئے زمین کے تمام خزانوں سے زیادہ قیمتی سمجھتا تھا۔ یکے بعد دیگرے تمام درباریوں کے ہاتھوں میں گردش کرتے کے بعد پھر راجہ کے پاس پہنچ گئے۔ وہ کبھی خنجر کا دستہ ٹٹولتا اور کبھی ڈبیا کھول کر دیکھتا۔ بالآخر اس نے زبیر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے تمھارے بادشاہ کو دیکھوں۔"

زبیر نے کہا۔ "ہمارا کوئی بادشاہ نہیں۔"

راجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابوالحسن بھی یہی کہا کرتا تھا کہ مسلمان کسی کو بادشاہ نہیں بناتے۔ آہ! بے چارہ کتنا اچھا آدمی تھا۔ تلوار کا دھنی، بات کا پکا۔ اس کی لڑکی کو کس قدر صدمہ ہوگا اور وہ عبدالرحمٰن اور یوسف کس قدر شریف تھے۔ بھگوان جانے یہ خبر سن کر ان کے بال بچوں کی کیا حالت ہوگی، آپ اُن سے ملے ہیں؟"

"جی نہیں! میں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔" زبیر نے اپنی جیب سے ایک خط نکال کر راجہ کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ خط مجھے بصرہ کے حاکم نے دیا ہے۔"

راجہ نے دلیپ سنگھ کو اشارہ کیا۔ دلیپ سنگھ نے زبیر سے خط لے لیا اور اسے کھول کر ترجمہ سنانے لگا۔

"مہاراج کو والئ بصرہ سلام کہتے ہیں۔ وہ عرب تاجروں کی بیواؤں اور یتیم بچوں کے ساتھ نیک سلوک کے ممنون ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ مہاراج ان بیواؤں اور یتیم

بچوں کو بصرہ پہنچا دینے کا بندوبست کریں، وہ آپ کے ایلچی کے ساتھ اپنی فوج کے ایک سالار زبیر کو ایک جہاز دے کر بھیج رہے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ آپ بہت جلد اُن کی روانگی کا بندوبست کر دیں گے۔ والئ بصرہ کا خیال ہے کہ ابوالحسن اور اس کے ساتھی ہندوستان کے مغربی ساحل پر کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔ اگر یہ پتہ چلا کہ ان کا جہاز کسی علاقہ کے بحری لٹیروں نے غرق کیا ہے تو انھیں سزا دینے میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہوگی۔"

خط کا مضمون سننے کے بعد راجہ گردن جھکائے دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ زبیر نے راجکمار کی طرف دیکھا۔ وہ آبدیدہ ہو کر چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زبیر نے کہا۔ "آپ بہت پریشان ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو عربوں کے ساتھ بہت اُنس تھا۔"

راجکمار کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اس نے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کی پھر اپنی جگہ سے اُٹھا اور کوئی بات کیے بغیر عقب کے کمرے میں چلا گیا۔

راجہ کو بذاتِ خود ابوالحسن کے ساتھ دلی لگاؤ تھا۔ اس کی موت کی خبر اس کے لیے کم المناک نہ تھی لیکن مسلمانوں کے خلیفہ کے ایلچی کی موجودگی کا احساس اسے انتہائی ضبط سے کام لینے پر مجبور کر رہا تھا۔ راجکمار کے اُٹھ جانے کے بعد اس نے زبیر اور دلیپ سنگھ کے سوا تمام درباریوں کو رخصت کا حکم دیا اور زبیر سے کہا۔ "راجکمار کو ابوالحسن کے ساتھ بے حد اُنس تھا۔ میں بھی اسے اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ مجھے اس کی موت کا بہت دُکھ ہے لیکن یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی مر چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ انھیں راستے میں بحری ڈاکوؤں نے گرفتار کر لیا ہو۔ مجھے سب سے زیادہ بے چاری ناہید کا دُکھ ہے۔ ابھی وہ اپنی ماں کا غم نہیں بھولی۔ اب یہ صدمہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔"

زبیر نے سوال کیا۔ "ناہید کون ہے؟"

راجہ نے جواب دیا۔ "وہ ابوالحسن کی اکلوتی بیٹی ہے۔ میں بھی اسے اپنی ہی بیٹی سمجھتا ہوں۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔" اس کے بعد راجہ دلیپ سنگھ کی طرف متوجہ ہوا۔ "دلیپ!

انھیں مہمان خانے میں لے چلو! اس بات کا خیال رکھنا کہ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، میں ذرا جلد ہی کو اُن بچّوں کو تسلّی دینے کے لیے بھیجتا ہوں۔"

زبیر نے کہا۔ "میں سیدھا آپ کے پاس چلا آیا تھا۔ ان بچّوں کو ابھی تک نہیں دیکھا۔"

"بہت اچھا۔ دلیپ سنگھ! انھیں اُن کے پاس لے جاؤ!"

(۲)

محل کے دروازے پر دلیپ سنگھ اور زبیر کو انیس[19] برس کا ایک نوجوان ملا۔ اس نے دلیپ سنگھ کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ ابّا جان کا جہاز جدّہ نہیں پہنچا؟"

دلیپ سنگھ نے ہاتھ بڑھا کر اُسے گلے لگا لیا اور کہا۔ "خالد! میں ہر شہر اور ہر بندرگاہ میں انھیں تلاش کر چکا ہوں لیکن ان کا کچھ پتہ نہیں چلا۔"

خالد نے کہا۔ "بس ابھی بندرگاہ سے ہو کر آیا ہوں۔ عرب کے چند جہاز ران بتاتے تھے کہ ان کا جہاز سندھ کے ساحل کے قریب غرق ہو چکا ہے۔ آپ دیبل کے حاکم سے ملتے، شاید کوئی سُراغ مل جاتا۔"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ "سندھ کا راجہ اور اس کے اہلکار بہت مغرور ہیں، مجھے ڈر تھا کہ دیبل کا سردار مجھے کوئی تسلّی بخش جواب نہ دے گا۔ اس لیے میں نے خود وہاں جانے کی بجائے مکران کے مسلمان گورنر سے کہا تھا کہ وہ اپنا ایلچی بھیج کر معلوم کریں۔ دمشق میں آپ کے خلیفہ اور بصرہ میں حجّاج بن یُوسف سے ملنے کے بعد میں واپسی پر پھر مکران کے حاکم سے ملا تھا۔ سندھ سے ان کا ایلچی واپس آ چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دیبل کے حاکم نے اس جہاز کے متعلق لاعلمی ظاہر کی ہے۔"

خالد نے کہا۔ "میں بندرگاہ سے سیدھا اسی طرف آیا ہوں۔ کیا آپ ہمارے گھروں میں یہ خبر پہنچا چکے ہیں؟"

"نہیں! ہم ابھی وہاں نہیں گئے۔ میں انھیں مہمان خانے میں ٹھہرا کر تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔"

خالد زبیر کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ کی مہمان نوازی ہمارا حق ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ کم از کم عورتوں اور بچّوں کو تسلّی دینے کے لیے تو ــــــ!"

زبیر نے کہا۔ "چلو دلیپ سنگھ!"

اس نے جواب دیا۔ "اگر مناسب خیال کریں تو آپ خالد کے ساتھ ہو آئیں میں اتنی دیر میں آپ کے ساتھیوں کو ٹھہرانے کا انتظام کر آؤں۔"

زبیر خالد کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں اس نے پوچھا۔ "تم ابوالحسن کے بیٹے ہو؟"

"ہاں! لیکن آپ کو کس نے بتایا؟"

"میں تمام راستے دلیپ سنگھ سے تم لوگوں کے متعلق پوچھتا آیا ہوں۔ اس کی باتوں سے تمھاری جو تصویر میرے ذہن میں تھی، تم اس سے مختلف نہیں ہو۔ جس صبر و سکون کے ساتھ تم نے یہ المناک خبر سُنی ہے میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ تم سچ مچ خالد ہو؟"

خالد نے اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "جب ابّا جان حج کے لیے رخصت ہو رہے تھے تو میں نے بھی ساتھ جانے کیلیے اصرار کیا تھا۔ امّی کی علالت کی وجہ سے اُنھوں نے مجھے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ میں اس وقت پہلی بار رویا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر انھیں بہت دُکھ ہوا تھا۔ انھوں نے کہا۔ "بیٹا! خالد رویا نہیں کرتے۔ میں نے تمھیں اس مجاہدِ اعظم کا نام دیا ہے جو زخموں سے چُور ہونے کے باوجود اُف تک نہ کرتا تھا۔"

(۳)

شہر کے ایک کونے پر ایک ندی کے پاس عرب تاجروں کے مکانات تھے۔ ندی

کے دونوں کناروں پر ناریل کے سرسبز درخت کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد خالد نے پتھر کی ایک چاردیواری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے ہمارا مکان۔"

چاردیواری کے اندر کیلوں اور ناریل کے درختوں کا ایک گنجان باغیچہ تھا۔ پتھر کے چھوٹے سے مکان کے سامنے ایک چبوترے پر بانس کا چھپر تھا، جسے ایک ہری سبز بیل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوا بند ہونے سے فضا میں حرارت بڑھ رہی تھی۔ زبیر کو پسینے میں شرابور دیکھ کر خالد نے اُسے مکان کے اندر لے جانے کی بجائے اس چبوترے پر بٹھانا مناسب خیال کیا۔

زبیر بید کے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ خالد کے اشارے سے ایک سیاہ فام لڑکا پنکھے سے اسے ہوا دینے لگا۔ سیاہ فام لڑکا پنکھا ہلانے میں ایک طرح کی مسرت محسوس کر رہا تھا لیکن زبیر نے خالد سے کہا۔ "ہمیں اس گرمی میں اسے تکلیف نہیں دینا چاہیے! اسے کہو آرام کرے۔"

سیاہ فام لڑکے نے عربی میں جواب دیا۔ "آپ ہمارے مہمان ہیں۔ مجھے خدمت کے حق سے محروم نہ کیجیے!"

زبیر نے کہا۔ "اوہو! تم عربی جانتے ہو؟"

لڑکے کی بجائے خالد نے جواب دیا۔ "یہ بچپن سے ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ اسے ہمارے ابّا جان نے پالا تھا۔"

لڑکے نے مزید تعارف کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "اور میں مسلمان ہوں میرا نام علی ہے۔"

خالد نے سراندیپ کی زبان میں کچھ کہا اور علی پنکھا رکھ کر بھاگتا ہوا پاس ہی ایک ناریل کے اونچے درخت پر چڑھ کر چند ناریل توڑ لایا۔

ناریل کا پانی پینے کے بعد زبیر خالد سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ اپنے باپ کے المناک

انجام کی خبر کے باوجود خالد عربوں کی روایتی مہمان نوازی کا ثبوت دینے کے لیے زبیر کی ہر بات میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم زبیر نے کئی بار محسوس کیا کہ اس کے ہونٹوں پر ایک غمگین مسکراہٹ آہوں اور آنسوؤں سے کہیں زیادہ جگر دوز تھی۔

باتیں کرتے کرتے خالد نے کئی بار باہر کے پھاٹک کی طرف اُٹھ اُٹھ کر دیکھنے کے بعد علی سے پوچھا۔ "علی! ناہید ابھی نہیں آئی۔ جاؤ اسے بُلا لاؤ!"

علی اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ خالد نے زبیر سے کہا۔ "مہارانی اور راجہ کی بیٹی کو میری بہن سے بہت محبت ہے۔ آج صبح وہ خود یہاں آکر اسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ اسے یہ خبر سُن کر بہت صدمہ ہوگا۔ وہ ابھی تک امّی کی قبر پر ہر روز جایا کرتی ہے اور اب!"

یہاں تک کہہ کر وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہوگیا۔

زبیر نے مغموم لہجے میں پوچھا۔ "آپ کی والدہ کب فوت ہوئیں؟"

"انھیں فوت ہوئے دو مہینے ہو چکے ہیں۔ ابّا کے حج پر جانے کے بعد وہ چھ مہینے موسمی بخار میں مبتلا رہیں لیکن ان کی موت کا باعث ابّا جان کا لاپتہ ہونا تھا۔ وہ صبح اور شام مکان کی چھت پر چڑھ کر سمندر کی طرف دیکھا کرتی تھیں۔ جب دُور سے کوئی جہاز نظر آتا تو ان کے چہرے پر رونق آجاتی۔ وہ مجھے خبر لانے کے لیے بندرگاہ کی طرف بھیجتیں اور جب میں مایوس لوٹتا تو دور سے میری شکل دیکھتے ہی ان کی آنکھیں پتھرا جاتیں۔ زندگی کی آخری شام اُن میں زینے پر پاؤں رکھنے کی ہمّت نہ تھی۔ ان کے اصرار پر ہم اُن کی چارپائی چھت پر لے گئے۔ وہ تکیے کا سہارا لے کر دیر تک سمندر کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہیں۔ بدقسمتی سے ہمیں اس دن کوئی جہاز بھی دکھائی نہ دیا۔ میں نمازِ مغرب کی اذان سُن کر نیچے اترا اور یہاں سے نزدیک ہی ایک مسجد میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو وہ آخری سانس لے چکی تھیں۔ ان کی آنکھیں کھُلی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دُور افق پر کسی جہاز کو دیکھ رہی ہیں۔ ناہید نے مجھے بتایا کہ ان کے آخری الفاظ یہ تھے:

"ناہید! تمہارے ابّا آئیں گے اور ضرور آئیں گے — وہ بے وفا نہیں، میں بے وفا ہوں، جو اُن کا انتظار نہ کر سکی۔"

زبیر نے اپنی بائیس سالہ زندگی میں تیروں اور نیزوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تھا۔ وہ ایک نڈر ملاح تھا اور فقط طوفانوں سے کھیلنا جانتا تھا۔ اس کی زبان میٹھے اور شیریں الفاظ سے ناآشنا تھی۔ خالد کی باتوں سے بے حد متاثر ہونے کے باوجود وہ تسلّی اور تشفّی کے موزوں الفاظ تلاش نہ کر سکا۔ وہ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا "خالد! مجھے ان کے حسرت ناک انجام کا بہت دُکھ ہے۔ کاش! میں تمہارے حصّے کا بوجھ اُٹھا سکتا۔"

علی بھاگتا ہوا واپس آیا اور کہنے لگا۔ "وہ آرہی ہیں۔"

زبیر کی نگاہیں نادانستہ باہر کے دروازے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ ناہید آئی اور دور سے اپنے بھائی کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر جھجکی، رُکی اور چہرے پر نقاب ڈال لیا۔ ایک لمحہ کے توقف کے بعد وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھی۔

زبیر کو ایک دلگداز آواز سنائی دی۔ "کیا یہ سچ ہے کہ ابّا جان ......"

فقرے کا آخری حصّہ ہچکیوں میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

زبیر نسوانی حُسن و وقار کی ایک غیر فانی جھلک دیکھ چکا تھا۔ اس کی نگاہیں اس کے لیے تیار نہ تھیں اور پیشتر اس کے کہ ناہید کا چہرہ نقاب میں چھپتا، اس کی نگاہوں کا رُخ بدل چکا تھا۔ وہ سامنے دیکھنے کی بجائے نیچے دیکھ رہا تھا۔

زبیر میں غایت درجہ کی حیا، والدین اور ماحول کی تربیت کا نتیجہ تھی اور اس کے علاوہ اس کے کردار کی سب سے بڑی خوبی حد درجہ خود اعتمادی تھی۔ وہ لڑکپن میں اپنے باپ کے ساتھ دور دراز کے ممالک میں چکر لگا چکا تھا۔ اوائلِ شباب میں اسے ایک تجربہ کار جہازران مانا جاتا تھا۔ وہ دور دراز کے ممالک میں غیر اقوام کی اُن شوخ و طرار

لڑکیوں کو دیکھ چکا تھا جو متاثر ہونے والی نگاہوں کی تلاش میں پھرتی ہیں۔ شام اور فلسطین میں بے شمار بے باک نگاہیں اس کے مردانہ حسن کا اعتراف کر چکی تھیں، لیکن اس دَور کے عام نوجوانوں کی طرح وہ نگاہیں نیچی رکھنے کا عادی تھا۔

زبیر جہاز پر سفر کے دوران دلیپ سنگھ سے ہر عرب بچّے کے متعلق سوالات پوچھ کر اپنے ذہن میں ان کی خیالی تصویریں بنا چکا تھا۔ دلیپ سنگھ سے ابوالحسن اور اس کے بچّوں کے متعلق جو کچھ وہ سُن چکا تھا، اس سے اس کا اندازہ یہ تھا کہ ابوالحسن کے بچّے شکل و شباہت اور عادات و اطوار میں باقی تمام بچّوں سے مختلف ہوں گے۔ یہ اُس کی دلچسپی کی پہلی وجہ تھی۔ پھر خالد کی زبانی جو کچھ اُس نے سُنا، اس کی دلچسپی میں اضافہ بھی ہو گیا اور اس کے بعد جب علی ناہید کو بلانے کے لیے گیا تو سابقہ دلچسپی کے ساتھ ایک ہلکی سی خلش کا بھی اضافہ ہو گیا لیکن اس کی دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کی قوم کی ایک ستم رسیدہ لڑکی تھی۔

ناہید نے پھر کہا۔ "مجھے جواب دیجیے، کیا یہ سچ ہے؟ آپ مجھ سے کیا چھپانا چاہتے ہیں۔ میں سُن چکی ہوں۔"

خالد نے اُٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ "ناہید! تقدیر کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا۔"

زبیر نے اُسے تسلّی دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس کوئی خوشی کی خبر نہیں لا سکا۔"

ناہید کوئی اور بات کیے بغیر مکان کی طرف چل دی اور چند قدم آہستہ آہستہ اٹھانے کے بعد بھاگ کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔

خالد ایک لمحہ کے لیے تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر زبیر کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔"

خالد بھاگ کر ناہید کے کمرے میں داخل ہوا۔ ناہید بستر پر منہ کے بل پڑی ہچکیاں بھر رہی تھی۔ خالد نے پیار سے اس کا بازو پکڑ کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ناہید! صبر سے کام لو۔"

علی زبیر کے پاس تھوڑی دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ ناہید کی آہیں سن کر اسے زمین کی ہر شے اداس اور غمگین نظر آ رہی تھی۔ وہ سہمتا اور جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور ڈرتے ڈرتے خالد کے بازو کو چھو کر بولا۔ "آپا ناہید کیوں رو رہی ہیں؟"

خالد نے اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "علی! ابا جان واپس نہیں آئیں گے۔"

کمسن بچے کے منہ سے ایک جگر دوز چیخ نکلی۔ "نہیں نہیں! یہ نہ کہیے! وہ ضرور آئیں گے۔"

خالد نے کہا۔ "یہ دلیپ سنگھ کے ساتھ آئے ہیں۔ ان کا جہاز شاید غرق ہو چکا ہے۔"

علی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے اور وہ ہونٹ بھینچ بھینچ کر چیخوں کو ضبط کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کسی ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں اس کی آواز سننے والا کوئی نہ ہو لیکن باہر نکلتے ہی اس نے پڑوس کے بہت سے لوگ اپنے گرد جمع کر لیے۔ تھوڑی دیر میں عربوں کے تمام بچے، عورتیں اور مرد خالد کے مکان کے صحن میں جمع ہو گئے۔ لوگوں کا شور و غوغا سن کر خالد باہر نکلا اور بیک وقت کئی زبانیں اس سے مختلف سوالات پوچھنے لگیں۔

طلحہ نے آگے بڑھ کر سب کو خاموش کیا اور خالد سے پوچھا۔ "کیا جہاز کے غرق ہونے کی خبر درست ہے؟"

خالد نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس نے زبیر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیا یہ خبر آپ لائے ہیں؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں کسی اچھی خبر کا ایلچی نہ بن سکا۔"

طلحہ نے پوچھا۔ "جہاز کیسے غرق ہوا؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "ہم یہ معلوم نہ کر سکے۔"

زبیر نے بیواؤں اور یتیموں کو فرداً فرداً تسلی دینے کے بعد عرب واپس جانے کے متعلق ان کے ارادے دریافت کیے۔

یتیم بچوں اور بیواؤں نے یک زبان ہو کر واپس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ زبیر دیر تک ان کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ بالآخر نماز عصر کی اذان سن کر اس نے لوگوں کے ہمراہ مسجد کا رخ کیا۔

طلحہ کے اصرار پر زبیر نے امام کے فرائض انجام دیے۔ جب وہ مسجد سے نکلا تو دروازے پر راجکمار اور دلیپ سنگھ کھڑے تھے۔ خالد کو دیکھ کر راجکمار کی سیاہ اور چمکدار آنکھیں پرنم ہو گئیں اور اس نے آگے بڑھ کر خالد کو گلے لگا لیا۔

دلیپ سنگھ نے زبیر سے کہا۔ "مہاراج نے آپ کو یاد کیا ہے۔ خالد تم بھی چلو!"

زبیر نے کہا۔ "میں ابھی ان سے مل کر آیا ہوں۔ کوئی خاص بات تو نہیں؟"

"مہاراج کے دل پر ابوالحسن کی موت کی خبر نے گہرا اثر کیا تھا۔ اس وقت وہ آپ سے زیادہ دیر باتیں نہ کر سکے۔"

زبیر نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ راجکمار کو بھی ان کے ساتھ گہری محبت تھی۔ ان کے آنسو ابھی تک خشک نہیں ہوئے۔"

دلیپ سنگھ نے کہا۔ "ہاں! راجکمار کو بہت صدمہ ہوا ہے۔ وہ انھیں بہت پیار کرتے تھے۔"

(۴)

شاہی محل کی طرف جاتے ہوئے زبیر کو لوگوں کا ایک ہجوم جلوس کی شکل میں دکھائی دیا۔ دلیپ سنگھ نے کہا۔ "مہاراج! آپ کے تحائف اور گھوڑوں کو دیکھ کر پھولے نہیں سماتے۔ ان کے حکم سے گھوڑوں کا جلوس نکالا گیا۔ گھوڑوں کی لگام تھام کر بازار میں چلنے کی عزت ان لوگوں کے حصے میں آئی ہے جو ہماری ریاست کے سب سے بڑے سردار ہیں۔ اگر انھیں ابوالحسن کی موت کا غم نہ ہوتا تو شاید خود بھی اس جلوس میں شرکت کرتے۔"

زبیر نے قریب سے دیکھا تو دربار میں سب سے اگلی کرسیوں پر براجمان ہونے والے آٹھ سردار گھوڑوں کی لگامیں تھامے ہجوم کے آگے چلے آ رہے تھے۔ گھوڑوں پر جو دوشالے ڈالے گئے تھے وہ بیش قیمت موتیوں سے مرصع تھے۔

راجکمار نے مسکراتے ہوئے زبیر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کیا آپ کے ملک میں بھی گھوڑوں کی یہ عزت ہوتی ہے؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "نہیں! ہم زیادہ تر ان کے چارے اور پانی کی فکر کیا کرتے ہیں۔"

دلیپ سنگھ بولا۔ "یہ گھوڑوں کی عزت نہیں۔ گھوڑے بھیجنے والوں کی عزت کی جا رہی ہے۔"

آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور ہوا نسبتاً خوشگوار ہو رہی تھی۔ راجہ محل کی دوسری منزل پر ایک دریچے کے سامنے بیٹھا سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

زبیر اور اس کے ساتھیوں کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اٹھ کر زبیر کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد خالد کی طرف متوجہ ہوا۔ "بیٹا! مجھے

تمھارے باپ کی موت کا بہت دکھ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا جہاز طوفان کے باعث غرق ہو چکا ہے لیکن اگر یہ ثابت ہو گیا کہ راستے میں کسی نے حملہ کر کے اُن کا جہاز غرق کر دیا ہے تو میں اس کی سرکوبی کے لیے اپنے تمام ہاتھی اور سارے جہاز بصرہ کے حاکم کے سپرد کر دوں گا۔"

راجہ سامنے کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے بیٹھ گیا۔ زبیر اور خالد بھی بیٹھ گئے لیکن دلیپ سنگھ کھڑا رہا۔

راجہ نے دلیپ سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بیٹھ جاؤ! تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ کل سے تم ہمارے دربار میں تمام سرداروں سے آگے راجکمار کے پاس بیٹھا کرو۔"

دلیپ سنگھ آگے بڑھ کر راجہ کے پاؤں چھونے کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا اور راجہ زبیر سے مخاطب ہوا۔ "میں بصرہ کے حاکم کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا لیکن اگر آپ عرب بچوں کو لاوارث سمجھ کر یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔ میں انھیں اپنے بچے سمجھتا ہوں۔ اگر وہ یہاں رہیں تو ان کی ہر ضرورت ہمارے شاہی خزانے سے پوری ہوگی۔ آپ ان سے پوچھ لیں، اگر انھیں یہاں کوئی تکلیف ہو تو بے شک انھیں اپنے ساتھ لے جائیے۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "انھیں یہاں کوئی شکایت نہیں اور میں اپنی حکومت اور تمام عربوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری قوم کے یتیم بچے اپنے ملک سے اس قدر دور رہیں۔ ان کی بہترین تعلیم و تربیت وہیں پر ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ پسند کریں گے تو انھیں یہاں بھیج دیا جائے گا۔"

راجہ نے پوچھا۔ "آپ سب کو لے جانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں! طلحہ اور چند تاجر یہیں رہیں گے۔"

"لیکن خالد اور اس کی بہن بھی تو یہیں رہیں گے نا؟"

"نہیں! یہ بھی میرے ساتھ جائیں گے!"

راجکمار نے مغموم لہجے میں کہا۔ "نہیں! انھیں ہم نہیں جانے دیں گے۔ خالد کو میں اپنا بھائی بنا چکا ہوں۔"

"اور ناہید میری بہن ہے۔" پچھلے کمرے کے پردے کی آڑ سے ایک نسوانی آواز آئی اور چودہ پندرہ برس کی ایک لڑکی راجہ کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ اس کا رنگ راجکمار کی طرح سانولا تھا لیکن چہرے کے نقوش اُس کی نسبت تیکھے، آنکھیں خوبصورت اور چمک دار تھیں۔ اس نے خالد کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بھیا! تمھیں ماتا جی بلاتی ہیں۔"

خالد اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور لڑکی نے چلتے چلتے راجہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "پتا جی! آپ ان کی باتیں نہ سُنیں۔"

راجہ نے زبیر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دیکھا آپ نے؟"

زبیر نے کہا۔ "بہت اچھا، میں ان کی مرضی پر چھوڑتا ہوں۔"

خالد تھوڑی دیر بعد سر جھکائے واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ راجہ نے پوچھا۔ "بیٹا! انھوں نے یہ فیصلہ تم پر چھوڑ دیا ہے۔ اب تم بتاؤ! تم یہاں رہنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

خالد نے جواب دیا۔ "آپ کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ اگر میرے پیش نظر دنیا کا کوئی آرام ہوتا تو میں آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑتا لیکن اس وقت ہماری قوم دُور دراز کے ممالک میں جہاد کر رہی ہے اور میری رگوں میں ایک مجاہد کا خون ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ موجودہ وقت کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے مجھ سے کم عمر کے لڑکے بھی جہاد پر جا رہے ہیں۔ میں اس سعادت سے محروم نہیں رہنا چاہتا۔"

راجہ کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد بولا۔ "بیٹا! تم ابوالحسن کے بیٹے ہو۔ اگر تم ارادہ کر چکے ہو تو مجھے یقین ہے کہ تمھیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ خوش نصیب ہے وہ قوم جس کی مائیں تمھارے جیسے بچے جنتی ہیں۔"

خالد نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے خوشی سے اجازت دیں۔"

راجہ نے جواب دیا۔ "ابوالحسن کے بیٹے کی خوشی میری ناراضگی کا باعث نہیں ہوسکتی۔"

قزاق

دس دن بعد ایک صبح بندرگاہ پر دو جہاز سفر کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ایک جہاز پر زبیر یتیم بچوں اور بیواؤں کو لیے جارہا تھا اور دوسرے جہاز پر دلیپ سنگھ راجہ کی طرف سے حجاج بن یوسف اور خلیفہ ولید کے لیے ہاتھی، سونا، چاندی اور ہیروں کے تحائف لے کر جارہا تھا۔ ہاتھی تعداد میں دس تھے۔

راجہ اور ولی عہد زبیر اور اس کے ساتھیوں کو رخصت کرنے کے لیے بندرگاہ تک آئے۔ راجہ بیواؤں اور یتیم بچوں میں سے ہر ایک کو گرانقدر تحائف دے چکا تھا۔ زبیر کو اس نے کئی چیزیں پیش کیں لیکن اس نے فقط گینڈے کی ڈھال پسند کی۔ رانی اپنا موتیوں کا بیش قیمت ہار سخت اصرار کے بعد ناہید کو پہنا سکی۔ راجکماری رخصت کے دن اس کے گھر آئی اور بضد ہو کر ناہید کو اپنی ہیرے کی انگوٹھی دے گئی۔

بندرگاہ پر جہاز میں سوار ہونے سے پہلے راجکمار نے آبدیدہ ہو کر خالد کو گلے لگا لیا اور اپنی موتیوں کی مالا اتار کر اس کے گلے میں ڈال دی۔

جہازوں کے بادبان کھولے گئے اور ہوا کے جھونکے جہازوں کو دھکیلنے

لگے۔ شہر کے لوگوں نے اپنے مہمانوں کو آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ الوداع کہی۔

عورتوں کے لیے جہاز کے اندر ایک کشادہ کمرے کے علاوہ بالائی تختہ کے ایک حصے پر بھی چلمنیں ڈال کر پردے کا انتظام کیا گیا تھا۔ خالد اِدھر اُدھر گھوم پھر کر ملاحوں کے کام میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ناہید، علی کے ساتھ تختہ جہاز پر کھڑی ناریل کے ان بلند قامت اور سرسبز درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ جن کی چھاؤں میں اس نے زندگی کے بہترین دن گزارے تھے۔

صبح شام میں تبدیل ہو گئی اور سراندیپ کا ساحل افق پر ایک ہلکی سی سرسبز لکیر نظر آنے لگا۔ آہستہ آہستہ یہ لکیر بھی شام کے دھندلکے میں چھپ گئی۔ وہ آنسو جو دیر سے ناہید کی آنکھوں میں جمع ہو رہے تھے، ٹپک پڑے۔ علی بھی اپنا آبائی وطن چھوڑنے پر قدرے ملول تھا۔ لیکن اس کے دل میں خالد اور ناہید کے ساتھ جانے کی خوشی اس سے کہیں زیادہ تھی۔

رات کے وقت مطلع صاف تھا۔ بچے اور عورتیں عرشے پر کھلی ہوا میں سو گئے۔ ناہید دیر تک آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتی رہی۔ چلمن کی دوسری طرف خالد، زبیر اور ملاحوں سے باتیں کر رہا تھا۔

ہاشم ایک آٹھ سال کا لڑکا ناہید کے قریب لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ماں فوت ہو چکی تھی اور باپ ابوالحسن کے ساتھ لاپتہ ہو چکا تھا۔ ہاشم اٹھ کر بیٹھتے ہوئے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ناہید نے پوچھا۔ "کیا ہے ہاشم ___؟"

اس نے سوال کیا۔ "علی کہاں ہے؟"

"وہ خالد کے ساتھ ملاحوں سے باتیں کر رہا ہے۔"

"میں اس سے ایک بات پوچھ کر ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر ہاشم تاریکی میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا علی کے پاس پہنچا اور پوچھنے لگا۔ "علی! جب جہاز ڈوب جاتا ہے تو کیا

ہوتا ہے؟"

علی نے بھولے پن سے جواب دیا۔ "سمندر کی تہہ میں چلا جاتا ہے۔"

ملاح اس جواب پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ہاشم نے پھر کہا۔ "واہ! یہ تو مجھے معلوم تھا۔ میں پوچھتا ہوں، لوگ کہاں جاتے ہیں؟"

"لوگوں کو مچھلیاں کھا جاتی ہیں۔"

"جھوٹ! مچھلیوں کو تو آدمی کھاتے ہیں۔"

علی نے پھر جواب دیا۔ "زمین پر آدمی مچھلیوں کو کھاتے ہیں لیکن سمندر میں مچھلیاں آدمیوں کو کھا جاتی ہیں۔"

ہاشم کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا اور واپس آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

(۲)

چند دنوں کے بعد یہ جہاز مالابار کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ راستے میں سامانِ خوراک اور تازہ پانی حاصل کرنے کے لیے انھیں مغربی ساحل کی مختلف بندرگاہوں پر لنگر انداز ہونا پڑا۔ اس دوران میں انھیں کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ مالابار کی ایک بندرگاہ پر چند عرب تاجروں نے زبیر کا خیر مقدم کیا اور گذشتہ طویل سفر میں تھکے ہوئے مسافروں کو چار دن کے لیے اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ ان چار دنوں میں سراندیپ کے راجہ کے گرانقدر تحائف کی خبر دُور دُور تک مشہور ہو چکی تھی۔

رخصت کے دن حاکمِ شہر بندرگاہ پر زبیر اور دلیپ سنگھ سے ملا اور اس نے انھیں راستے میں بحری ڈاکوؤں کے حملے کے خطرے کے پیشِ نظر ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ "آپ فکر نہ کریں! ہمارے جہاز پوری طرح مسلح ہیں۔"

تیسرے دن مستول پر سے دونوں جہازوں کے پہرے داروں نے یکے بعد دیگرے افقِ شمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دو جہازوں کی آمد کا پتہ دیا اور جہاز ران پریشان ہو کر تختۂ جہاز پر کھڑے ہو گئے۔ دلیپ سنگھ کا جہاز آگے تھا۔ وہ اپنے جہاز کو روکنے کا حکم دے کر زبیر کا جہاز قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب دونوں جہاز ایک دوسرے کے بہت تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہو گئے تو دلیپ سنگھ نے کہا۔ "ممکن ہے وہ جہاز بحری ڈاکوؤں کے نہ ہوں، لیکن ہمیں مقابلے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ آپ اپنا جہاز مغرب کی طرف لے جائیں، میں ان سے نمٹ لوں گا۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "نہیں ہم خطرے میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔"

دلیپ سنگھ نے کہا۔ "مجھے آپ کی ہمت پر شبہ نہیں لیکن ہماری سب سے پہلی ذمہ داری بچوں کی جان بچانا ہے۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "اگر وہ واقعی بحری ڈاکو ہیں، تو ممکن ہے کہ مغرب کی طرف سے بھی انھوں نے ہمارا راستہ روک رکھا ہو۔ اس صورت میں بھاگ نکلنے کی بجائے لڑنا کم خطرناک ہو گا اور ہم سے یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم اپنے دوستوں کی جانیں خطرے میں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔"

"آپ کی مرضی۔ تاہم عورتوں کو حکم دیں کہ وہ نیچے چلی جائیں۔"

دلیپ سنگھ یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے میں مصروف ہو گیا۔

زبیر نے خالد سے کہا "خالد! تم عورتوں اور بچوں کو نیچے لے جاؤ!"

دونوں جہازوں کے ملاح کیل کانٹے سے لیس ہو کر دور سے آنے والے جہازوں کو دیکھنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد دلیپ سنگھ ایک جہاز کا سیاہ جھنڈا پہچان کر چلایا۔ "یہ بحری ڈاکوؤں کے جہاز ہیں۔ مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ!"

زبیر نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بھائیو! یہ عورتیں اور بچے ہمارے

پاس امانت ہیں۔ ہمیں انھیں سلامتی سے بصرہ پہنچانا ہے۔ اگر ہم پر ان کی حفاظت کی ذمہ داری نہ ہوتی، تو ہمارا طریقِ جنگ اس طریقے سے مختلف ہوتا جو میں نے اب تجویز کیا ہے۔ میں ایک خطرناک مہم کے لیے تم میں سے دو رضاکار چاہتا ہوں۔"

اس پر سب سے پہلے خالد اور اس کے بعد تمام ملاحوں نے یکے بعد دیگرے اپنے نام پیش کیے۔ زبیر نے کہا۔ "اس کام کے لیے دو بہترین تیراک درکار ہیں۔ میں یہ کام ابراہیم اور عمر کو سونپتا ہوں۔"

زبیر کی ہدایت پر دونوں جہازوں سے دو کشتیاں سمندر میں اتار دی گئیں اور ان کے ساتھ بادبان باندھے گئے۔ دلیپ سنگھ کے جہاز پر ہاتھیوں کے لیے خشک گھاس موجود تھی۔ ملاحوں نے اس کے چند گٹھے اتار کر کشتیوں پر لاد دیے۔ ابراہیم اور عمر ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں لے کر کشتیوں پر سوار ہوگئے۔ اس کے بعد زبیر اور اس کے ساتھی ترکش اور کمانیں سنبھال کر حملہ آوروں کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔ اگلے جہاز کا رخ دلیپ سنگھ کے جہاز سے زیادہ زبیر کے جہاز کی طرف تھا۔ عمر اور ابراہیم کی کشتیاں ایک لمبا چکر کاٹ کر حملہ آوروں کے عقب میں پہنچ چکی تھیں۔

زبیر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگتا ہوا اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ حملہ آور جہاز نے قریب آتے ہی زبیر کے جہاز پر تیر برسانے شروع کر دیئے اور ایک تیر سن سے زبیر کے سر کے قریب سے گزر گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "آپ کسی محفوظ جگہ بیٹھ جائیے! ہم دشمن کے تیروں کی زد میں آچکے ہیں۔"

زبیر نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ ناہید تیر و کمان ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ آنکھوں کے سوا اس کا باقی چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ زبیر نے کہا۔ "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ جاؤ نیچے!"
ناہید نے اطمینان سے جواب دیا۔ "آپ میری فکر نہ کریں۔ میں تیر چلانا جانتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ کر ایک سپاہی کے قریب بیٹھ گئی۔

کچھ دیر تیروں کی لڑائی ہوتی رہی۔ لٹیرے زیادہ قریب پہنچ کر جلتے ہوئے تیر پھینکنے لگے۔ دوسری طرف سے زبیر کی ہدایت کے مطابق ابراہیم اور عمر نے اپنی کشتیاں سیدھی لٹیروں کے جہازوں کی طرف چھوڑ دیں اور قریب پہنچ کر جلتی ہوئی مشعلوں سے گھاس کو آگ لگائی اور خود پانی میں کود گئے۔ لٹیرے جو ہاتھوں میں کمندیں لیے ہوئے اپنے حریف کے جہازوں پر کودنے کے لیے تیار کھڑے تھے بدحواس ہو کر کشتیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہوا کے جھونکوں نے کشتیوں سے آگ کے شعلوں کو جہازوں کے بادبانوں تک پہنچا دیا۔ آن کی آن میں لٹیروں کے دونوں جہازوں پر آگ بے قابو ہو چکی تھی اور وہ چیختے چلاتے سمندر میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دلیپ سنگھ اور زبیر کے آدمی تیر برسا رہے تھے۔ زبیر نے لٹیروں کا ایک جہاز اپنے جہاز کے بالکل قریب آتا دیکھ کر آگ کے خطرہ سے بچنے کے لیے لنگر اٹھانے کا حکم دیا لیکن اتنی میں آٹھ دس لٹیرے کمندیں ڈال کر زبیر کے جہاز پر کودنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ زبیر کے ساتھیوں نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا۔ لٹیروں کے جہاز سے ایک تیر آیا، اور زبیر کے بائیں بازو میں پیوست ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی ناہید کی کمان سے ایک تیر نکلا اور ایک لٹیرے کے سینے میں پیوست ہوگیا۔

زبیر نے مرحبا کہا۔ ناہید نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ زبیر کمان پھینک کر بازو سے تیر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ناہید نے جلدی سے کمان نیچے رکھ کر ایک ہاتھ سے زبیر کا بازو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے تیر کھینچ کر نکال دیا۔ تیر کے نکلتے ہی زبیر کے بازو سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ ناہید نے اس کی قمیص کی آستین اوپر چڑھائی اور جھٹ سے اپنے چہرے کا نقاب اتار کر زخم پر باندھ دیا۔

زبیر کا جہاز کمندوں کی زد سے نکل چکا تھا اور جلتے ہوئے جہاز کے رہے سہے

ملاح مایوس ہو کر پانی میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔ زبیر نے دوبارہ کمان اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ناہید! اب تم عورتوں کے پاس جاؤ اور انھیں تسلی دو کہ ہم خدا کے فضل سے فتح حاصل کر چکے ہیں۔"

ناہید نے چلتے چلتے رک کر پوچھا۔ "آپ کو تکلیف تو نہیں؟"

"نہیں یہ بہت معمولی زخم ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔" یہ کہتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے زبیر کی نگاہیں غیر ارادی طور پر ناہید کے چہرے پر گڑ گئیں۔ سپاہیانہ وقار اس کے خدوخال کی دلکشی میں اضافہ کر رہا تھا۔ ناہید نے اچانک محسوس کیا کہ وہ بے نقاب ہے، اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی نیچے اتر کر عورتوں کے پاس چلی گئی۔

چلتے ہوئے جہاز سے چند آدمی اتر کر ایک کشتی پر سوار ہوئے اور ایک آدمی جو ڈاکوؤں کا سردار معلوم ہوتا تھا، سفید جھنڈا لہرانے لگا۔ زبیر نے تیر اندازوں کو ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ عمر اور ابراہیم اپنا کام کر کے جہاز کے قریب پہنچ چکے تھے۔ زبیر نے اپنے جہاز کو خطرے سے محفوظ پا کر لنگر ڈالنے اور رسیوں کی سیڑھی نیچے پھینکنے کا حکم دیا۔ عمر اور ابراہیم جہاز پر چڑھ آئے۔ خالد نے زبیر کو دلیپ سنگھ کے ساتھیوں کی طرف متوجہ کیا جو ابھی تک سمندر میں غوطے کھانے والے دشمنوں پر تیروں کی مشق کر رہے تھے۔ زبیر نے انھیں بھی ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور لٹیرے قدرے مطمئن ہو کر سیڑھی کے ذریعے جہاز پر چڑھنے لگے۔ سب سے آخر میں لٹیروں کے سردار کی کشتی دونوں جہازوں کے درمیان آکر رکی۔ ایک قوی ہیکل اور معمر آدمی جس کی داڑھی کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے، زخمی شیر کی طرح جہاز والوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کشتی میں زبیر کی نظر ایک نوجوان اور ایک لڑکی پر پڑی۔ دونوں شکل وصورت اور لباس کے اعتبار سے لٹیروں سے بہت مختلف تھے۔

زبیر نے قوی ہیکل اور بارعب آدمی کو ڈاکوؤں کا سردار سمجھ کر اس کی طرف اشارہ

کیا اور ملاح کشتی کو کھینچتے ہوئے جہاز کے قریب لے آئے اور یکے بعد دیگرے رسی کی سیڑھی پر چڑھتے ہوئے اوپر آگئے۔ لڑکی کے چہرے سے علالت اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ خوش وضع اور خوش پوش نوجوان اس کا بازو پکڑ کر سہارا دے رہا تھا اور وہ سنبھل سنبھل کر سیڑھی پر پاؤں رکھ رہی تھی۔

جہاز پر پہنچ کر نوجوان نے ایک اجنبی زبان میں کچھ کہا اور لٹیروں کی طرف گھورنے لگا۔ زبیر نے اس کی زبان پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی محسوس کیا کہ وہ لٹیروں کے مظالم کی شکایت اور اس کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔

زبیر نے اپنی استطاعت کے مطابق سندھ اور سراندیپ کی ملی جلی زبان میں اسے تسلی دی۔ نوجوان اور لڑکی اس کے دوستانہ لہجے سے متاثر ہو کر تشکر آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ لڑکی نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی سہمی ہوئی آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر زبیر کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی عمر چودہ پندرہ سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ خوبصورت چہرہ دوپہر کے پھول کی طرح کملایا ہوا تھا۔ زبیر نے پھر ایک بار ان دونوں کو تسلی دی۔ سب سے آخر میں ڈاکوؤں کا سردار جہاز پر پہنچا۔ اس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسوؤں کی بجائے انتقام کی بجلیاں تھیں۔

تھوڑی دیر میں دلیپ سنگھ اپنے جہاز سے اتر کر کشتی کے ذریعے زبیر کے جہاز پر پہنچ گیا اس نے آتے ہی ڈاکوؤں کے سردار کو مارنے کے لیے چابک اٹھایا لیکن زبیر نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ دلیپ سنگھ نے زبیر کی قمیص کی آستین کو خون آلود دیکھ کر پوچھا۔ "آپ زخمی ہیں؟"

زبیر نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "یہ معمولی زخم ہے۔"

خوش پوش نوجوان نے کچھ کہہ کر دلیپ سنگھ کو اپنی طرف متوجہ کیا اور دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے اس کے بعد دلیپ سنگھ نے ڈاکوؤں کے سردار سے

چند باتیں کرنے کے بعد عربی زبان میں زبیر کے ساتھیوں سے کہا۔ "کشتی میں ایک صندوق پڑا ہوا ہے اسے اوپر لے آؤ"۔

ملاحوں نے صندل کی لکڑی کے چھوٹے سے صندوق کو رسّے کے ساتھ باندھ کر اوپر کھینچ لیا۔ دلیپ سنگھ نے ڈھکنا اوپر اٹھایا اور تمام ملاح حیران ہو کر سونے، موتیوں اور جواہرات سے بھرے ہوئے صندوق کو دیکھنے لگے۔

زبیر کے استفسار پر دلیپ سنگھ نے خوش پوش نوجوان سے چند سوالات اور پوچھے اور اس نے اپنی آپ بیتی سنائی:

(۳)

نوجوان کا نام جے رام تھا۔ وہ کاٹھیاواڑ کے ایک عالی نسب راجپوت خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اوائل شباب میں اسے شہرت اور ناموری کا شوق سرزمین سندھ تک لے گیا۔ برہمن آباد کے ایک میلے میں اس نے تیر اندازی میں اپنے کمالات دکھا کر سندھ کے راجہ کو اپنا قدردان بنا لیا۔ راجہ نے اسے اپنی فوج میں ایک معمولی عہدہ دے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ دو سال کی خدمت گزاری کے بعد جے رام نے دیبل کے نائب حاکم کی جگہ حاصل کر لی۔ دیبل میں آئے ہوئے اسے ایک ہفتہ نہ ہوا تھا کہ گھر سے اسے اپنے باپ کی وفات اور ماں کی علالت کی خبر ملی اور وہ چند ماہ کی رخصت لے کر کاٹھیاواڑ پہنچا۔ گھر پہنچنے کے دس دن بعد اس کی والدہ بھی چل بسی۔ گھر میں اب صرف اس کی ایک چھوٹی بہن مایا دیوی تھی۔ جے رام نے رشتہ داروں کی نصیحت اور مایا دیوی کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر واپس سندھ جانے کا خیال چھوڑ دیا، لیکن چار ماہ گھر میں قیام کرنے کے بعد اسے اپنی پرسکون زندگی تلخ محسوس ہونے لگی اور ایک دن اس نے کاٹھیاواڑ کے راجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ملازمت کی درخواست کی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سندھ کے راجہ نے اپنا حلقۂ اقتدار وسیع کرنے کے لیے پڑوس کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر رکھی تھی اور خود مختار سردار اور راجے اسے اپنا طاقتور ہمسایہ تسلیم کرنے کے ثبوت میں اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اس کی نذر کیا کرتے تھے۔ کاٹھیاواڑ کے راجہ کو اگرچہ براہ راست سندھ کے راجہ سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ تاہم وہ کچھ سونے اور چاندی کے عوض اسے اپنا دوست بنانا غنیمت سمجھتا تھا۔

جے رام کو اپنے دربار میں کوئی عہدہ دینے کی بجائے اس نے سندھ میں اس کے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھانا زیادہ مناسب خیال کیا، اور اسے سونے، جواہرات اور موتیوں کا ایک صندوق دے کر سندھ کے راجہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ جے رام کو یقین تھا کہ راجہ داہر اسے واپس نہ آنے دے گا۔ اس لیے اس نے اپنی اکیلی بہن مایا دیوی کو گھر پر چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ مایا دیوی بھی اس کے ساتھ جانے پر بضد تھی۔ اس لیے یہ دونوں اپنا گھر بار چچازاد بھائی کے سپرد کر کے سندھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن کاٹھیاواڑ اور سندھ کے درمیان ان کے جہاز کو بحری ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے ساتھی بہادری سے لڑے لیکن ڈاکوؤں کے سامنے ان کی پیش نہ گئی۔ ڈاکوؤں نے جواہرات کے صندوق پر قبضہ کر لیا، جے رام اور مایا دیوی کے سوا ان کے باقی ساتھیوں کو سمندر کے کنارے لا کر آزاد کر دیا۔ ڈاکوؤں کا سردار یہ سمجھتا تھا کہ جے رام اور مایا دیوی راجہ کاٹھیاواڑ کے عزیز ہیں اور وہ ان کی جان بچانے کے لیے ایک معقول رقم ادا کرنے پر آمادہ ہو جائے گا اس لیے وہ کاٹھیاواڑ کے ساحل کے غیر آباد حصے پر لنگر انداز ہو کر راجہ سے یہ سودا کرنا چاہتا تھا لیکن ان کے ایک جاسوس نے اسے سراندیپ کے جہازوں کی آمد کی خبر کر دی، اور اس نے کاٹھیاواڑ ٹھہرنے کی بجائے مالابار کا رخ کیا۔

زبیر نے یہ قصہ سن کر پھر ایک بار جے رام اور اس کی بہن کو تسلی دی اور کہا۔ "یہ لٹیرے جیسے ہمارے مجرم ہیں ویسے ہی آپ کے مجرم ہیں۔ میں نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ انھیں کیا سزا دی جائے۔ تاہم میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے ملک میں انھیں کیا سزا دی جاتی ہے؟"

جے رام نے جواب دیا۔ "ایسے ظالم ڈاکوؤں کے لیے ہمارے قانون میں اور آپ کے قانون میں رحم کی کوئی گنجائش نہیں ہے تاہم جب ان لوگوں سے آپ کا مقابلہ ہو رہا تھا تو مجھے اور میری بہن کو جہاز کے ایک کونے میں بند کر دیا گیا تھا اور جہاز کو آگ لگ جانے کے بعد یہ لوگ ہمیں وہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اپنے لیے میں شاید ان سے رحم کی درخواست نہ کرتا لیکن اپنی بہن کے لیے مجھے عاجز ہونا پڑا اور ان لوگوں نے ہمیں کشتی پر سوار کرنے سے پہلے یہ وعدہ لیا کہ میں آپ سے ان لوگوں کی جان بخشی کے لیے سفارش کروں گا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ انھیں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ میں انھیں صرف موت کی سزا سے بچانا چاہتا ہوں لیکن یہ ضروری ہے کہ جب تک ان کے راہ راست پر آجانے کا اطمینان نہ ہو انھیں قید میں رکھا جائے۔"

مایا دیوی علالت کی وجہ سے دیر تک کھڑی نہ رہ سکی۔ اس نے اپنے بھائی سے کچھ کہا اور پیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتا۔ دلیپ سنگھ نے کہا۔ "اوہو ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ آپ کی بہن علیل ہیں۔ خالد بیٹا! انھیں اپنی بہن کے پاس لے جاؤ۔"

خالد آگے بڑھا اور مایا دیوی اپنے بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ جے رام نے دلیپ سنگھ سے پوچھا۔ "اس جہاز پر عورتیں بھی ہیں؟"

"جی ہاں! آپ کی بہن کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ ہاں بیٹی جاؤ! تم آرام کرو۔"

(۴)

جہازوں کی دوبارہ روانگی سے پہلے لٹیروں کے سردار کے سوا باقی تمام قیدیوں کو دلیپ سنگھ کے جہاز میں منتقل کر دیا گیا۔ زبیر نے دلیپ سنگھ سے تاکید کی کہ جب تک ان کی سزا کا فیصلہ نہ ہو ان کے ساتھ بدسلوکی نہ کی جائے۔ ڈاکوؤں کے سردار کو اس کے ساتھیوں کی نیک چلنی کی ضمانت کے طور پر زبیر نے اپنے جہاز پر ٹھہرا لیا۔ جے رام نے اپنی بہن کی علالت کے پیش نظر زبیر کے جہاز پر رہنا پسند کیا۔

خالد نے مایا دیوی کو ناہید کے پاس پہنچا دیا۔ ناہید نے اسے ایک بستر پر لٹا دیا اور عرب عورتیں اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ پہلی ملاقات میں میزبانوں اور مہمانوں کے درمیان فقط اشاروں سے ہمدردی اور تشکر کے جذبات کی ترجمانی ہوتی رہی۔

دلیپ سنگھ نے اپنے جہاز پر جانے سے پہلے جے رام سے کہا۔ "آپ کو شاید کھانے کی تکلیف ہو۔ میں ایک مدت مسلمانوں کے ساتھ رہ کر چھوت چھات کا قائل نہیں رہا۔ ہم سب ایک ہی دسترخوان پر کھا لیتے ہیں۔ میرے ساتھ جتنے آدمی ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو مسلمانوں کے ساتھ نہ کھا چکا ہو۔ تاہم میرا ایک آدمی جسے میں اس جہاز پر چھوڑ رہا ہوں آپ دونوں کے لیے کھانا تیار کرے گا اور آپ کے میزبان آپ کی مرضی کے بغیر آپ کو اپنے دسترخوان پر بیٹھنے کے لیے مجبور نہیں کریں گے۔"

دلیپ سنگھ نے چند باتیں زبیر کو سمجھائیں اور اتر کر اپنے جہاز پر چلا گیا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے اس کے ساتھی اپنے کنداستروں سے پانچ سفید ریش لٹیروں کے سر اور داڑھیاں، مونچھیں اور بھنویں مونڈ چکے تھے۔ ایک ڈاکو جو شکل و صورت سے زیادہ معمر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی صرف آدھی داڑھی، ایک مونچھ اور آدھا سر صاف کرنے پر اکتفا کیا گیا تھا۔

ناہید اور دوسری عرب عورتوں نے دل و جان سے مایا دیوی کی تیمارداری کی۔ پیچی بخار کے لیے ناہید سراندیپ سے چند جڑی بوٹیاں اپنے ساتھ لائی تھی ان کے استعمال سے مایا دیوی تین چار دن میں تندرست ہو گئی۔

زبیر نے اپنے بازو کے زخم کو معمولی سمجھ کر شروع شروع میں چنداں پروا نہ کی لیکن مرطوب ہوا کے باعث زخم میں تیسرے دن پیپ پڑ گئی اور اسے درد کی شدت اور بخار کی وجہ سے چند دن بستر پر لیٹنا پڑا۔

دلیپ سنگھ کئی بار اپنا جہاز چھوڑ کر اس کی تیمارداری کے لیے آیا۔ علی، خالد اور ہاشم ناہید اور دوسری عرب عورتوں کو ہر آن اس کی حالت سے باخبر رکھتے۔ جے رام ہر وقت اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ مایا دیوی ایک عورت کی ذکاوت حس کی بدولت ناہید کے مغموم اور پریشان رہنے کی وجہ سمجھ چکی تھی۔ وہ اپنے بھائی کی موجودگی میں کبھی کبھی زبیر کو دیکھ آتی اور واپس آ کر اشاروں اور عربی کے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں جنھیں وہ دن رات عرب عورتوں کی صحبت میں رہ کر یاد کر چکی تھی۔ ناہید کو تسلی دیتی۔

ایک شام زبیر کی حالت قدرے مخدوش تھی۔ دلیپ سنگھ آیا اور زخم کی مرہم پٹی کرنے کے بعد چلا گیا۔ رات کے وقت مطلع ابر آلود تھا اور ہوا تیز تھی ملاح اپنی اپنی جگہ پر متعین تھے۔ جے رام، خالد اور علی زبیر کی تیمارداری کر رہے تھے۔

عرب عورتیں عشاء کی نماز کے لیے اٹھیں اور مایا دیوی اپنے بھائی سے زبیر کا حال پوچھنے چلی گئی۔ جب ناہید نماز سے فارغ ہو کر زبیر کی صحت کے لیے دعا کر رہی تھی خالد نے آ کر بتایا کہ زبیر بیہوش ہے۔

ایک عمر رسیدہ عورت نے کہا۔ "ہمارے تمام آدمی آندھی کی وجہ سے جہاز پر مصروف ہیں۔ ہمیں ان کے پاس ضرور جانا چاہیے۔"

تمام عورتیں اٹھ کر زبیر کے پاس پہنچیں۔ مایا دیوی نے انھیں دیکھ کر اپنے بھائی

کی طرف اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ جے رام نے کئی راتیں آنکھوں میں کاٹی تھیں۔ وہ باہر نکلتے ہی جہاز کے ایک کونے میں لیٹ کر گہری نیند سو گیا۔

آدھی رات کے وقت زبیر کا بخار قدرے کم ہوا۔ اور ناہید اور مایا دیوی کے علاوہ باقی عورتیں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ خالد اور علی وہیں لیٹ گئے۔

رات کے تیسرے پہر زبیر نے آنکھیں کھولیں اور شمع کی روشنی میں مایا دیوی اور ناہید کو دیکھ کر پوچھا۔ "آپ یہاں؟ جائیں آرام کریں!"

ناہید کا مرجھایا ہوا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور اس نے سوال کیا۔ "اور آپ اب کیسے ہیں؟"

"اور میں اب ٹھیک ہوں۔ مجھے پانی دیجیے!"

مایا دیوی نے اٹھ کر صراحی سے پانی کا پیالہ بھرا اور ناہید کے ہاتھ میں دے دیا۔

ناہید نے جھجکتے ہوئے ایک ہاتھ سے زبیر کے سر کو سہارا دے کر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے پانی کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

زبیر نے پانی پی کر پھر تکیے پر سر رکھ دیا اور ناہید سے کہا۔ "ان کے بھائی نے میرے لیے بہت تکلیف اٹھائی۔ وہ اب کہاں ہیں؟"

"وہ باہر سو رہے ہیں۔"

"آپ بھی جا کر سوئیں! مجھے اب آرام ہے۔ دلیپ سنگھ کے نئے مرہم نے بہت فائدہ کیا ہے۔"

(۵)

چند دنوں کے بعد زبیر چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ عربوں کا خلق جے رام کو بہت متاثر کر چکا تھا۔ زبیر سے اس کا انس، انتہائی درجے کی عقیدت اور محبت کی حد تک پہنچ چکا

تھا۔ وہ زبیر سے عرب کے تازہ حالات کے متعلق کافی واقفیت حاصل کر چکا تھا۔ عربوں کے نئے دین میں انسانی مساوات کے تخیل نے اسے شروع شروع میں بہت پریشان کیا لیکن زبیر کی تبلیغ سے وہ جلد ہی اس بات کا قائل ہو گیا کہ دنیا بھر میں قیامِ امن کے لیے تمام اقوام کا کسی ایسے دین کو قبول کرنا ضروری ہے۔ جو ہر انسان کو مساوی حقوق دیتا ہو۔ جو تمام انسانوں کو رنگ و خون اور نسل سے نہیں بلکہ اعمال سے پہچانتا ہو۔ ابتدا میں اس نے کھانے پینے کے معاملے میں مسلمانوں کی چھوت سے پرہیز کیا لیکن چند دن زبیر کی صحبت میں رہ کر اسے چھوت اور اچھوت کا امتیاز مضحکہ خیز نظر آنے لگا اور ایک دن وہ اپنی بہن سے مشورہ کیے بغیر زبیر کے دسترخوان پر بیٹھ گیا۔

مایا دیوی میں اپنے بھائی سے بھی پہلے ایک ذہنی انقلاب آچکا تھا اور اس انقلاب کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اپنے بھائی کی طرح اسلام کی تعلیم سے واقف ہو چکی تھی بلکہ اس کی وجہ عربوں کا وہ اخلاق تھا۔ جس نے ایک غیور راجپوت لڑکی کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ ایک اجنبی قوم کے انسانوں کے رحم پر ہے۔ مسلمان ملاح اسے دیکھتے اور آنکھیں جھکا لیتے۔ پہلے ہی دن وہ یہ محسوس کرنے لگی کہ ان سب کی نگاہیں اس کے بھائی کی نگاہوں سے مختلف نہیں۔

ناہید کی تیمارداری نے بھی اسے بہت متاثر کیا تھا۔ ان سب سے زیادہ وہ خالد کے طرزِ عمل سے متاثر تھی۔ نہ جانے کیوں اس کی نگاہیں اسے دیکھنے اور کان اس کی آواز کو سننے کے لیے بیقرار رہتے اور جب وہ سامنے آتا اسے آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی۔ وہ بے پروائی سے منہ پھیر کر گزر جاتا اور وہ دیر تک اپنے دل کی دھڑکنیں سنتی رہتی۔ کبھی طرح طرح کے خیالات سے پریشان ہو کر وہ اپنے آپ کو کوستی۔

رات کے وقت وہ اپنے ہم عمر لڑکے سے مرعوب ہونے کے بجائے اسے نفرت اور حقارت اور بے پروائی سے دیکھنے کا ارادہ لے کر سوتی لیکن صبح کی اذان کے بعد جب عرب

نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔ وہ ان ارادوں کے باوجود اٹھ کر عرشے پر چلی جاتی اور ایک طرف کھڑی ہو کر نیلگوں سمندر کی لہروں سے دل بہلانے کی کوشش کرتی لیکن جلد ہی اکتا کر منہ پھیر لیتی اور نمازیوں کی طرف دیکھتی غیر شعوری طور پر اس کی نگاہیں خالد پر مرکوز ہو جاتیں۔ خالد کی وجہ سے اسے دوسرے نمازیوں کا رکوع و سجود پسند آتا۔ نماز کے بعد خالد کے ہاتھ بلند ہوتے دیکھ کر اسے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا طریقہ دلکش معلوم ہوتا۔

اسلام کے ساتھ اس کی پہلی دلچسپی اس لیے تھی کہ یہ خالد کا دین تھا۔ عربی زبان وہ اس لیے سیکھنے کی کوشش کرتی تھی کہ یہ خالد کی زبان تھی۔

[illegible]

گنگو اور اس کی سرگزشت

ڈاکوؤں کے سردار کو پابہ زنجیر رکھا گیا تھا۔ دلیپ سنگھ کی ہدایت تھی کہ اس پر کسی قسم کا اعتبار نہ کیا جائے۔ اسے دونوں وقت کھانا پہنچانے کا کام علی کے سپرد تھا اور علی کو ہر وقت یہ فکر رہتی کہ شاید اس کا پیٹ نہیں بھرا اور ہر کھانے پر بوڑھے سردار کو علی کے اصرار پر ایک دو لقمے زیادہ ہی کھانے پڑتے۔

زبیر کا سلوک بھی اس کی توقع کے خلاف تھا۔ زبیر دن میں ایک دو دفعہ ضرور اس کے پاس آتا۔ پہلی بار اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی سندھی میں باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن اسے جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ وہ عربی میں بے تکلفی سے بات چیت کر سکتا ہے۔

ایک دن اس نے زبیر سے کہا۔ "موت کے انتظار میں جینا میرے لیے بہت صبر آزما ہے۔ اگر آپ مجھ پر رحم نہیں کرنا چاہتے تو میں چاہتا ہوں کہ مجھے جو سزا ملنی ہے جلد مل جائے۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "مجھے تمہارے بڑھاپے پر ترس آتا ہے لیکن تمہیں اس وقت تک قید سے نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جب تک مجھے یہ یقین نہ ہو کہ تم آزاد ہو کر پھر یہی پیشہ اختیار نہ کرو گے۔"

اس نے جواب دیا۔ "میرے جہاز غرق ہو چکے ہیں اور اب میں بڑھاپے کے باقی دن کسی جنگل میں چھپ کر گزارنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتا ہوں۔"

"ڈاکو ہر جگہ خطرناک بن سکتا ہے۔ تم سمندر میں جہازوں کو لوٹتے تھے۔ خشکی پر لوگوں کے گھروں میں ڈاکے ڈالو گے۔ اگر میں تمہیں بصرہ لے جاؤں تو وہاں غالباً تمہارے ہاتھ کاٹے جائیں گے اور اگر تمہارا فیصلہ راجہ پر چھوڑوں تو باقی عمر تمہیں قید خانے کی کوٹھڑی میں گزارنی پڑے گی۔"

ڈاکوؤں کے سردار نے جواب دیا۔ "میں آپ کی حکومت کے متعلق کچھ نہیں جانتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ دیبل کی حکومت کو مجھے سزا دینے کا کوئی حق نہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ میں گذشتہ چند برس جو کچھ سمندر میں اپنے جہاز پر سوار ہو کر کرتا رہا ہوں۔ وہی کچھ سندھ کا راجہ تخت پر بیٹھ کر کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کے اہل کار کمزور اور غریب آدمیوں کو لوٹتے ہیں اور میرے ساتھی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی بجائے صرف بڑے بڑے جہازوں کو لوٹتے ہیں۔ ہمارا پیشہ ایک ہے لیکن نام ہمارے مختلف ہیں۔ میں ایک ڈاکو ہوں اور وہ ایک راجہ۔ اس کی طرح اس کا باپ بھی راجہ تھا لیکن میرا باپ میری طرح ایک ڈاکو نہ تھا۔ میں خود بھی ایک ڈاکو نہ بنتا لیکن ظلم نے مجھے ایسا بنا دیا۔ خیر ان باتوں کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ غالب ہیں اور میں مغلوب۔ لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ مجھے سندھ کی حکومت کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے خود جو سزا چاہیں دے لیں۔"

زبیر نے کہا۔ "میں تمہاری سرگذشت سننا چاہتا ہوں۔"

ڈاکوؤں کے سردار نے قدرے تامل کے بعد مختصر الفاظ میں اپنی سرگذشت یوں بیان کی:۔

(۲)

"میرا نام گنگو ہے۔ میں دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ اپنے باپ کی طرح میرا بھی پیشہ ماہی گیری تھا۔ بیس سال کی عمر میں میرے سر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا۔ ہمارے گاؤں میں ایک لڑکی تھی۔ اس کا نام لاجونتی تھا اور وہ تھی بھی لاجونتی۔ اس کی آنکھیں ہرنی کی آنکھوں سے زیادہ دلفریب اور اس کی آواز کوئل کی آواز سے زیادہ میٹھی تھی۔ لوگ اسے جل پری کہا کرتے تھے۔ گاؤں میں کوئی نوجوان ایسا نہ تھا جو لاجو پر جان دینے کے لیے تیار نہ ہو۔ لیکن وہ صرف مجھے چاہتی تھی اس کا باپ ایک سادہ دل آدمی تھا۔ برسات میں ایک دفعہ دریا زوروں پر تھا، تو اس نے شرط لگائی کہ میں لاجو کی شادی اس کے ساتھ کروں گا جو تیر کر دریا عبور کرے گا۔ ہمارے گاؤں میں اچھے اچھے تیراک تھے لیکن برسات میں دریا کا بہاؤ دیکھ کر کسی کو پانی میں کودنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں لاجو کے لیے جان تک قربان کرنے کو تیار تھا۔ میں نے یہ شرط پوری کی اور چند دنوں کے بعد میری اور اس کی شادی ہو گئی۔

ہم دونوں خوش تھے، اور زیادہ وقت کشتی پر گزارتے تھے۔ میں مچھلیاں پکڑا کرتا تھا وہ کھانا پکایا کرتی تھی، رات کے وقت ہم ہنستے ہنستے اور گاتے گاتے، تاروں کی چھاؤں میں سو جاتے۔ عجیب دن تھے وہ بھی۔"

یہاں تک کہہ کر گنگو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور دیر تک ہچکیاں لینے کے بعد اس نے پھر اپنی داستان شروع کی:۔

"لیکن ایک دن ایسا آیا کہ مجھے لاجو سے جدا ہونا پڑا۔ ہمیشہ کے لیے مجھے معلوم نہ تھا کہ ایک نیچ ذات اور کمزور آدمی کے لیے ایک خوبصورت بیوی رکھنا پاپ ہے ہمارے گاؤں سے ایک کوس کے فاصلے پر ہمارے علاقے کے سردار کا شہر تھا۔ ایک دن

وہ چند سپاہیوں کے ساتھ دریا پر آیا، اور مجھے پار لے جانے کے لیے کہا۔ کشتی پر سوار ہو کر وہ لاجو کو بری طرح گھور رہا تھا۔ اس کے پوچھنے پر میں نے اسے بتایا کہ یہ میری بیوی ہے۔ وہ بولا "یہ کسی ماہی گیر کی لڑکی معلوم نہیں ہوتی تم اسے کہاں سے لائے ؟" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس نے مجھے بتایا کہ میں شام تک واپس آ جاؤں گا۔ تم اتنی دیر میرا انتظار کرو۔ لیکن وہ شام سے پہلے ہی واپس آ گیا اور میں نے اسے دوسرے کنارے پہنچا دیا۔ وہ میرا نام پوچھ کر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ ہمارے گاؤں کے ماہی گیروں کا شکار دیکھنے کے بہانے کبھی کبھی ہمارے گاؤں میں چلا آتا۔ گاؤں کے لوگ اسے اپنے ساتھ بے تکلفی سے پیش آتا دیکھ کر خوش ہوتے لیکن لاجو نے ایک دن مجھ سے کہا کہ اس کی نیت درست نہیں۔ وہ میری طرف بہت بری نظروں سے دیکھتا ہے۔

ایک شام لاجو حسب معمول کشتی پر کھانا پکا رہی تھی۔ وہ گھوڑے پر آیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "تمہارے پاس کوئی تازہ شکار ہو تو لاؤ۔" میں نے تھوڑی دیر پیشتر دو بڑی مچھلیاں پکڑی تھیں۔ وہ میں نے اسے پیش کیں۔ اس نے مجھے مچھلیاں اٹھا کر اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ شہر دور نہ تھا، اور میں نے لاجو سے کہا۔ "میں کھانا تیار ہونے تک آ جاؤں گا۔"

میں اس کے گھوڑے کے پیچھے چل رہا تھا کہ راستے میں جھاڑیوں کی آڑ سے چند آدمی نمودار ہوئے اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے ان کی گرفت سے آزاد ہونے کی جدوجہد کی لیکن کسی نے میرے سر پر لاٹھی ماری اور میں تیورا کر گر پڑا۔ اس کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک تاریک کوٹھری میں پڑا ہوا تھا۔

(۳)

"دو دن میں بھوکا اور پیاسا جان کنی کی حالت میں وہاں پڑا رہا۔ تیسرے دن کوٹھری

کا دروازہ کھلا اور لاجونتی کے ساتھ تین آدمی جن میں سے ایک کھانا اور پانی اٹھائے ہوئے تھا، اور دو کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں، کوٹھری میں داخل ہوئے۔ لاجو کا رنگ زرد تھا اور اس کی آنکھیں دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنسوؤں کا تمام ذخیرہ ختم ہو چکا ہے۔ اس کا نگاہ پڑتے ہی بھوک اور پیاس بھول گئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر اس سے لپٹ جاؤں لیکن میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ لاجو نے سپاہیوں کی طرف دیکھا اور وہ تلواروں سے میری رسیاں کاٹ کر باہر نکل گئے۔

میں نے پوچھا "لاجو! تم یہاں کیسے پہنچیں؟" اور وہ ہونٹ بھینچ کر اپنی چیخوں کو ضبط کرتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی لیکن اچانک اس نے خوفزدہ ہو کر مجھے چھوڑ دیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے چلے آنے سے تھوڑی دیر بعد چند آدمیوں نے کشتی پر حملہ کیا اور اسے پکڑ کر سردار کے پاس لے آئے۔ اسے میرا حال معلوم نہ تھا اور وہ بے غیرتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دینا چاہتی تھی لیکن سردار نے اسے میری قید کا حال بتا کر یہ دھمکی دی کہ اگر اس کے محل میں بے حیائی کی زندگی بسر کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوئی تو تیرا شوہر اس کوٹھری میں بھوکا اور پیاسا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا۔ اب وہ میرے پاس آئی تھی، یہ بتانے کے لیے کہ گنگو تم آزاد ہو۔ تم جاؤ اور یہ سمجھو کہ تمہاری لاجو مر گئی۔ وہ اپنی عصمت سے میری آزادی کا سودا کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے غلط سمجھا۔ میں نے یہ سمجھا کہ وہ ایک غریب ملاح کی کشتی چھوڑ کر محلوں میں رہنا چاہتی ہے۔ میں نے اسے برا بھلا کہا، گالیاں دیں اور ان ظالم ہاتھوں سے چند تھپڑ بھی مارے لیکن وہ پتھر کی مورتی کی طرح کھڑی یہ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ اس نے صرف یہ کہا "گنگو! میں بے عزتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دوں گی لیکن میں یہاں اس لیے آئی ہوں کہ مجھے تمہاری جان اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ بھگوان کے لیے تم جاؤ! یہ موقع نہ گنواؤ۔ ممکن ہے کہ تم آزاد ہو کر مجھے اس ظالم کے پنجے سے چھڑانے کی کوئی

تدبیر سوچ سکو۔"

اس کے آنسوؤں اور آہوں نے میری غلط فہمی دور کر دی۔ میں نے اسے پھر گلے لگا لیا اور اس سے وعدہ کیا کہ میں جلد آؤں گا۔ میں اس محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

قید خانے کا دروازہ پھر کھلا، سپاہیوں کی بجائے وہ ظالم بھیڑیا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار نہ ہوتی تو میں یقیناً اس پر حملہ کر دیتا۔ اس نے آتے ہی لاجو سے کہا "اب بتاؤ کیا فیصلہ کیا تم نے؟ اس کی زندگی تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

لاجو نے جواب دیا۔ "اگر میں آپ کی شرط مان لوں، تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ زندہ اور سلامت شہر سے نکل جائیں گے؟"

اس نے کہا "میں وعدہ کرتا ہوں۔"

لاجو آنسو بہاتی ہوئی اس کے ساتھ چلی گئی اور مجھے چار سپاہی شہر سے باہر لے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں — مجھے سردار کے وعدے پر اعتبار نہ تھا۔ شہر سے باہر نکل کر جب ہم اس جنگل میں پہنچے جو دریا کے کنارے دور تک پھیلا ہوا تھا تو ایک شخص نے پیچھے سے اچانک مجھ پر وار کیا۔ مجھے پہلے ہی اس حملے کی توقع تھی اس لیے میں نے ایک طرف کود کر اپنے آپ کو بچا لیا۔ اس پر چاروں آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑے لیکن میں بھاگنے میں ان سے تیز تھا۔ میں جلد ہی جنگل میں پہنچ کر ایک جھاڑی کے نیچے چھپ گیا۔ وہ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

شام ہو رہی تھی، میں چھپتا چھپاتا دریا کے کنارے پہنچا۔ میری کشتی جل رہی تھی اور دریا کے کنارے وہ چاروں سپاہی کھڑے تھے۔ ان واقعات نے میرے جیسے امن پسند آدمی کو ایک بھیڑیا بنا دیا۔ میں گاؤں کی طرف بھاگا۔ میری آواز میں ایک اثر

تھا اور آن کی آن میں چند نوجوان لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لے کر میرے ساتھ نکل آئے ہمیں دیکھ کر سپاہی سراسیمہ ہو کر بھاگے لیکن ہم نے کسی کو بچ نکلنے کا راستہ نہ دیا اور چاروں کو مار کر ان کی لاشیں دریا میں پھینک دیں۔ آدھی رات تک میں نے ماہی گیروں کی بیس پچیس بستیوں سے کوئی دو سو جوان اکٹھے کر لیے اور تیسرے پہر سردار کے محل پر دھاوا بول دیا۔ شہر کے لوگ پہلے ہی اس کے مظالم سے تنگ تھے کوئی اس کی مدد کے لیے نہ نکلا۔ اس کے چند سپاہیوں نے مقابلہ کیا لیکن اکثر نے بھاگ کر لوگوں کے گھروں میں پناہ لی۔ ہم نے سردار کو پکڑ لیا اور اس سے لاجو کے متعلق پوچھا وہ ہر سوال پر صرف یہ جواب دیتا تھا۔ "میں بے قصور ہوں۔ بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو" میں نے مشعل دکھا کر اسے زندہ جلا دینے کی دھمکی دی تو وہ مجھے محل کی نچلی منزل کے ایک کمرے میں لے گیا۔ فرش پر لاجو کی لاش دیکھ کر میری چیخ نکل گئی وہ ہاتھ باندھ کر یہ کہہ رہا تھا۔ "میں نے اسے نہیں مارا اس نے خود مکان کی چھت سے چھلانگ لگا دی تھی۔ تم سپاہیوں سے پوچھ سکتے ہو۔ بھگوان کے لیے مجھ پر دیا کرو۔" میں نے جلتی ہوئی مشعل اس کی آنکھوں میں بھونک دی اور کلہاڑی کی پے درپے ضربوں سے اسے ٹکڑے کر دیے۔

اس کے بعد میں ایک ڈاکو تھا۔ میرے دل میں کسی کے لیے رحم نہ تھا۔ میں نے کئی سرداروں کو لوٹا اور جب راجہ کی فوجوں نے زمین ہمارے لیے تنگ کر دی۔ میں نے دریا کے راستے سمندر کا رخ کیا۔ دیبل کی بندرگاہ سے ہم نے رات کے وقت دو جہاز چوری کیے اس کے بعد میں اب تک کئی جہاز لوٹ چکا ہوں۔ میں ہر اس شخص کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں، جو راجوں اور سرداروں کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ مجھے ہر دولت مند انسان میں اس سردار کی روح نظر آتی ہے۔ مجھے ہر اونچے ایوان میں لاجونتی جیسی مظلوم لڑکیوں کی روحیں انتقام کے لیے پکارتی سنائی دیتی ہیں۔"

زبیر نے کہا۔ "مجھے اس لڑکی کی دردناک موت کا سخت افسوس ہے اور سردار سے

جنگ کرنے میں بھی شاید تم حق بجانب سمجھے جاسکو گے لیکن تم ایک انسان کے ظلم کا بدلہ دوسرے انسان سے کیسے لے سکتے ہو؟ تم نے ہمارے جہاز پر حملہ کیا اور اس پر کوئی سردار سوار نہ تھا۔ اس پر چند یتیم بچے اور عورتیں تھیں۔"

گنگو نے جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے لیکن دوسرے جہاز پر سراندیپ کے راجہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور آپ اس کے معاون تھے تاہم اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کے جہاز پر عورتیں اور بچے سوار ہیں تو میں حملہ نہ کرتا۔ چند ماہ ہوئے میں نے اسی سمندر میں آپ کے ملک کا ایک جہاز دیکھا تھا لیکن میں نے اسے صرف اس لیے چھوڑ دیا کہ اس پر مردوں کے علاوہ چند عورتیں بھی تھیں۔"

خالد یہ سن کر چلا اٹھا۔ "کیا اس پر سراندیپ کے چند ملاح تھے؟"

"ہاں!"

"وہ تو ابا کا جہاز تھا اور ابھی تک اس کا کوئی پتہ نہیں۔ تم جھوٹ کہتے ہو تم ان کا جہاز غرق کر چکے ہو۔"

گنگو نے جواب دیا۔ "اگر میں اس جہاز کو غرق کر چکا ہوتا۔ تو مجھے آپ کے سامنے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔"

"اس جہاز پر ہاتھی بھی تھے؟"

"ہاں!"

"تمھیں اس کے متعلق یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں غرق ہوا؟"

"نہیں مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ جہاز دیبل تک صحیح سلامت پہنچ گیا تھا۔"

زبیر نے پوچھا۔ "اس سمندر میں تمھارے سوا لٹیروں کا کوئی اور گروہ بھی ہے؟"

"ہاں!"

"کیا یہ ممکن ہے کہ دیبل کے حاکم نے وہ جہاز لوٹ لیا ہو؟"

"ہاں! میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ خشکی کے ڈاکو سمندر کے لٹیروں سے زیادہ بے رحم ہیں۔"

(۴)

اس گفتگو کے بعد گنگو کے ساتھ زبیر کی دلچسپی بڑھ گئی۔ جے رام عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ گنگو کی سرگذشت نے زبیر کی طرح اسے بھی متاثر کیا لیکن ایک وفادار سپاہی کی طرح وہ راجہ کو نکتہ چینی سے بلند سمجھتا تھا۔ وہ رعایا کے کسی فرد کا یہ حق تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ کسی ذاتی رنجش کی بنا پر راجہ کے خلاف اعلانِ جنگ کردے۔ وہ راجاؤں کی تقدیس کے مقابلے میں رعیت کی کمتری کا قائل تھا۔ تاہم جب زبیر نے گنگو سے پُرامن رہنے کا وعدہ لے کر اس کی زنجیریں کھلوا دیں، تو اس نے مزاحمت نہ کی۔

چند دن زبیر کی صحبت میں رہ کر گنگو نے اپنے خیالات میں ایک عجیب تبدیلی محسوس کی۔ زبیر نے چند ملاقاتوں میں روم اور ایران کے خلاف مسلمانوں کی ابتدائی جنگوں کا ذکر کرکے اس پر یہ ثابت کردیا تھا کہ دنیا میں صرف اسلام ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جو جبر و استبداد کی حکومتوں کا خاتمہ کرسکتا ہے۔ گنگو ایک ڈاکو کی زندگی اختیار کرنے کے بعد سماج کے تمام مذہبی عقائد سے کنارہ کش ہوچکا تھا۔ اس کے لیے دنیا ایک وسیع جھیل تھی، جس میں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگلتی ہیں، وہ خود کو ایک چھوٹی مچھلی سمجھتے ہوئے ہر بڑی مچھلی کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے تیار تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ اس کی ہمدردی کی پہلی وجہ یہ تھی کہ وہ روئے زمین کی بڑی مچھلیوں کے خلاف برسرِپیکار تھے۔

ایک دن زبیر نے اسے سمجھایا کہ تم ظلم کے خلاف جنگ کرنا چاہتے ہو لیکن تمہارے ہتھیار اپنے دشمن کے ہتھیاروں سے مختلف نہیں۔ انھوں نے تمہاری کشتی جلائی تھی اور تم ان کے جہاز جلاتے ہو۔ دونوں کا اصول ظلم ہے جس طرح کئی بے گناہ ان کے ظلم کا شکار ہوتے ہیں، اسی طرح کئی بے گناہ تمہارے ظلم کا شکار ہوتے ہیں۔ تم خود تسلیم کرچکے ہو کہ تم دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ تم دونوں میں کسی کے پاس عدل و انصاف اور امن کے لیے کوئی قانون نہیں۔ اور جب تک تم میں سے ایک کے پاس ایسا قانون نہیں، تمہاری تلواریں آپس میں ٹکراتی رہیں گی۔ ایک تلوار کند ہوگی تو تم دوسری اٹھالوگے، ایک کمان ٹوٹے گی تو تم دوسری بنالوگے لیکن ظلم کے مقابلے میں حق و انصاف پر لڑنے والے انسان اپنے حریف کی تلوار کُند ہی نہیں کرتے بلکہ اسے ہمیشہ کے لیے چھین لیتے ہیں۔ ایران اور روم پر عربوں کی فتح دراصل نظامِ باطل پر نظامِ حق کی فتح تھی۔ ظلم پر انصاف کی فتح تھی، ایران مصر اور شام کے وہ لوگ جو کل تک حق پرستوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، آج افریقہ اور ترکستان سے ظلم کی طاقتوں کو مٹانے کے لیے ہمارے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔"

گنگو نے متاثر ہوکر پوچھا: "کیا میں بھی آپ لوگوں کا ساتھ دے سکتا ہوں؟"

زبیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "ایک ڈاکو کی حیثیت سے نہیں۔ ہمارا کام بھٹکے ہوئے قافلوں کو لوٹنا نہیں بلکہ انھیں سلامتی کا راستہ دکھانا ہے۔ وہ انسان جو خود ایک غلط مسلک پر کاربند ہو، ایک صحیح اصول کا علمبردار نہیں ہوسکتا۔"

گنگو نے نادم سا ہوکر کہا: "اگر میں آپ کو یقین دلاؤں کہ میں ایک لٹیرے کی زندگی سے توبہ کرتا ہوں تو آپ مجھ پر یقین کرلیں گے؟"

"میں خوشی سے تم پر اعتبار کروں گا۔"

"اور آپ مجھے آزاد بھی کردیں گے۔"

زبیر نے جواب دیا "اگر تم توبہ کے لیے یہ شرط پیش کرو، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس لیے توبہ نہیں کر رہے ہو کہ تم اپنے افعال پر نادم ہو اور اپنی اصلاح کرنا چاہتے ہو بلکہ اس لیے کہ تم آزاد ہونا چاہتے ہو۔"

"لیکن میری توبہ سے آپ یہ خیال تو نہیں کریں گے کہ میں بزدل ہوں؟"

"نہیں توبہ کرنا بہت بڑی جرأت کا کام ہے۔"

"تو میں آپ سے ایک ڈاکو کا پیشہ ترک کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔"

"مجھے تم پر یقین ہے اور اگر تم اپنے ساتھیوں کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہو تو میں تم سب کو آزاد کر دوں گا، اور جس جگہ کہو تمھیں اتار دوں گا۔"

گنگو نے جواب دیا "میرے ساتھیوں نے صرف میری وجہ سے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو میری رہنمائی کے بغیر ایسی جرأت نہیں کر سکتے اگر آپ انھیں سندھ کے کسی غیر آباد حصے پر اتار دیں تو پھر ماہی گیروں کا پیشہ اختیار کر لیں گے وہ مدت سے میرے ساتھ ہیں اور انھیں کوئی پہچانے گا بھی نہیں لیکن ان میں چار آدمی خود سر ہیں۔ ان کے متعلق میں آپ کو یقین نہیں دلا سکتا۔ مجھے خود اپنے اوپر اعتماد نہیں اگر آپ نے مجھے آزاد کر دیا تو ممکن ہے کہ کسی ظالم سردار کو دیکھ کر میں صبر نہ کر سکوں اور پھر اسی ظلم پر اتر آؤں۔ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں تو ممکن ہے کہ آپ کے ملک میں رہ کر میں بھی آپ جیسا انسان بن جاؤں۔ وہ چار آدمی جن کا میں نے ذکر کیا ہے اگر میری طرح اس جہاز پر ہوتے، تو مجھے یقین ہے، کہ آپ کی باتیں انھیں بھی متاثر کرتیں، اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے ساتھیوں سے مل لوں۔"

---

(۵)

اگلے دن یہ جہاز ایک ٹاپو کے کنارے لنگر انداز ہوئے۔ زبیر گنگو کو ساتھ لے کر دلیپ سنگھ کے جہاز پر چلا گیا۔ گنگو نے اپنے ساتھیوں کے سامنے سندھی زبان میں ایک مختصر تقریر کی۔ رہائی کا مژدہ سن کر قیدیوں کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے لیکن جب گنگو نے یہ بتایا کہ وہ لوٹ مار سے توبہ کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ان کا ساتھ چھوڑ چکا ہے تو بعضوں کی خوشی غم میں تبدیل ہو گئی۔ گنگو نے یکے بعد دیگرے سب سے قسمیں لیں لیکن تین آدمی جن میں سے ایک وہ بھی تھا جس کے آدھے سر اور داڑھی اور مونچھوں پر دلیپ سنگھ کے ساتھی اپنے استروں کی دھار کی آزمائش کر چکے تھے۔ مذبذب سے ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

گنگو نے ان سے مخاطب ہو کر کہا "کالو، واسو اور موتی! تم کچھ عرصہ میرے ساتھ رہو گے۔"

اس کے بعد اس نے زبیر سے مخاطب ہو کر کہا "میں ان کے پرامن رہنے کی ضمانت دیتا ہوں۔" زبیر نے دلیپ سنگھ سے چند باتیں کرنے کے بعد ملاحوں کو قیدیوں کی زنجیریں کھول دینے کا حکم دیا۔

کالو، واسو، موتی اور گنگو زبیر کے ساتھ دوسرے جہاز پر چلے آئے، واسو کا عجیب وغریب حلیہ دیکھ کر تمام عرب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ علی نے بے اختیار ایک قہقہہ لگایا اور عورتوں تک یہ خبر پہنچانے کے لیے بھاگا اور جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ہاشم کے علاوہ چند اور بچے بھی تھے۔ تمام لوگ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ ہاشم نے آگے بڑھ کر معصومانہ انداز میں پوچھا "تمھارے چہرے کے بائیں طرف بال نہیں اُگتے؟"

تمام عرب ہنس پڑے۔ علی کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔ گنگو نے ہنستے ہوئے ہاشم کو گود میں اٹھا لیا۔

شام کے وقت خالد نے زبیر سے کہا "ناہید کا خیال ہے کہ گنگو کو اباجان کے جہاز کا ضرور علم ہوگا۔ وہ بذاتِ خود گنگو سے چند سوالات پوچھنے پر اصرار کر رہی ہے۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں ہمیں گنگو کی باتوں پر اعتبار کرنا چاہیئے۔"

خالد نے کہا۔ "لیکن ناہید یہ کہتی ہے کہ اگر اسے علم نہ بھی ہُوا تو بھی وہ پتہ لگانے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔ کل انھیں کوئی خواب نظر آیا تھا اور وہ یہ کہتی ہیں کہ اباجان زندہ ہیں۔"

"پوچھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن بہتر یہ ہوگا کہ وہ گنگو پر کوئی شک و شبہ ظاہر نہ کریں۔ جاؤ اپنی بہن کو لے آؤ، میں گنگو کو بلاتا ہوں۔"

دلیپ سنگھ نے گنگو کو بلا لیا اور ناہید کے ساتھ مایا دیوی بھی آگئی۔ ناہید کے چہرے پر ایک سیاہ نقاب تھا۔ اس نے مایا دیوی کے کان میں کچھ کہا، اور مایا دیوی کے اثبات میں سر ہلانے پر اپنا ہار اتار کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

مایا دیوی نے ہار گنگو کو پیش کرتے ہوئے کہا "آپ نے چند دن قبل ان کے باپ کے جہاز کا ذکر کیا تھا۔ اگر آپ ان کے باپ کا پتہ لگا سکیں تو یہ آپ کا انعام ہے۔"

گنگو نے رنج و ندامت سے آبدیدہ ہو کر یکے بعد دیگرے خالد اور زبیر کی طرف دیکھا اور پھر ناہید سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بیٹی! میں اتنا گرا ہوا نہ تھا!"

ناہید نے اس کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر کہا۔ "آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ مجھے آپ پر شک نہیں میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ ہماری مدد کریں۔"

"اس کے لیے مجھے ہار دینے کی ضرورت نہ تھی۔ میں زبیر کے احسان کا بدلہ نہیں اتار سکتا۔ اگر کوئی لٹیرا اس جہاز کو لوٹتا تو مجھے ضرور معلوم ہو جاتا لیکن مجھے

شک ہے کہ وہ جہاز دیبل کی بندرگاہ کے آس پاس شہر کے حاکم نے لوٹا ہے۔"

ناہید نے کہا۔ "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میرا باپ زندہ ہے۔"

گنگو نے جواب دیا۔ "اگر وہ زندہ ہے تو سندھ کے کسی ایسے قید خانے میں ہوگا۔ جہاں سے لوگ موت سے پہلے باہر نہیں نکلتے لیکن میں اُن کے سراغ لگانے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ اگر ان کا پتہ مل گیا تو میں مکران کے حاکم کے پاس اطلاع بھیج دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ زبیر سے مخاطب ہُوا۔ "آپ مجھے دیبل کے آس پاس اتار دیں اور جے رام اگر میری مدد کرے تو میں بہت جلد ان کا پتہ لگا سکوں گا۔"

مایا دیوی نے کہا۔ "میں اپنے بھائی کی طرف سے تمھاری مدد کا وعدہ کرتی ہوں۔ دیبل کا حاکم ان کا دوست ہے اور وہ ان سے کوئی بات نہیں چھپائے گا۔"

گنگو نے کہا۔ "حاکم کسی کے دوست نہیں ہوتے اور دیبل کے حاکم کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ زبیر سے مخاطب ہُوا۔ "آپ دیبل کی بندرگاہ پر ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "میرا تو ارادہ نہ تھا لیکن جے رام کے مجبور کرنے پر میں ایک دو دن ٹھہرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔"

گنگو نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "مجھے معلوم نہیں کہ سندھ کے راجہ اور دیبل کے حاکم پر جے رام کا کتنا اثر ہے۔ ورنہ میں آپ کو سندھ کے ساحل پر اترنے کا مشورہ نہ دیتا۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "ہمارے ساتھ سندھ والوں کے تعلقات اس قدر بُرے نہیں پچھلے دنوں ابوالحسن کے متعلق پوچھنے کے لیے والئ مکران وہاں گیا تھا۔"

اس کے ساتھ غرور سے ضرور پیش آیا لیکن اس پر دست درازی نہیں کی۔"

گنگو نے جواب دیا: "اس کا جہاز خالی ہوگا لیکن آپ کے جہاز پر ہاتھی ہیں اور وہ اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لیے ہاتھیوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے ساتھ عورتیں ہیں۔ جن کے لیے اس کے دل میں کوئی عزت نہیں۔"

دیبل

گنگو، کالو، داسو اور موتی کے علاوہ باقی تمام قیدی دیبل سے چند کوس دور ایک غیر آباد مقام پر اتار دیے گئے۔ گنگو، ابوالحسن کا سراغ لگانے کا بیڑا اٹھا چکا تھا، اس لیے اس نے ایک گجراتی تاجر کے بھیس میں اپنے باقی ساتھیوں کے ہمراہ دیبل کی بندرگاہ پر اترنے کا فیصلہ کیا۔ جے رام اس مہم میں گنگو کی مدد کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ تاہم اس نے زبیر کو بار بار یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ حکومتِ سندھ ایسا نہیں کر سکتی اگر ابوالحسن کا جہاز دیبل کے آس پاس لوٹا گیا ہے تو دیبل کے حاکم اور راجہ کو یقیناً اس کی خبر نہیں ہوگی۔

زبیر نے جواب دیا: "مجھے خود یہ شبہ نہیں۔ لیکن میں ناہید کے شبہات دور کرنا چاہتا ہوں۔"

شام سے کچھ دیر پہلے یہ جہاز دیبل کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئے، مایا دیوی نے تمام عرب عورتوں کو اپنے گھر لے جانے پر اصرار کیا۔ جے رام نے تمام ملاحوں کو دعوت دی۔ لیکن گنگو نے دلیپ سنگھ کے کان میں کچھ کہا، اور اس نے جے رام کو مشورہ دیا: "آپ کئی ماہ کے بعد دیبل واپس جا رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کی جائے قیام پر کسی اور کا قبضہ

ہو یہ بھی ممکن ہے کہ دیبل کا حاکم انھیں شہر میں جانے کی اجازت دینے میں کوئی عذر پیش کرے۔"

جے رام نے جواب دیا "اسے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ وہ خود آپ کا میزبان بننے پر اصرار کرے گا۔ اگر آپ میری مدد نہ کرتے تو کاٹھیا واڑ کے بیش قیمت تحائف راجہ کے پاس نہ پہنچ سکتے۔ اب تو راجہ پر بھی آپ کا حق ہے۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "آپ شہر کے گورنر سے مل آئیں۔ پھر ہمیں آپ کے ساتھ چلنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

مایا دیوی نے کہا۔ "بھیا! آپ جائیں۔ اگر آپ کے مکان پر کوئی اور قابض ہوا تو یہ بہت بری بات ہوگی۔ آپ مہمانوں کو ٹھہرانے کا انتظام کر آئیں۔ میں اتنی دیر بہن ناہید کے پاس ٹھہروں گی۔"

جے رام نے بندرگاہ سے ایک آدمی بلا کر اسے تحائف کا صندوق اٹھانے کا حکم دیا اور سیدھا دیبل کے گورنر پرتاپ رائے کے محل میں چلا گیا۔ پرتاپ رائے نے کاٹھیاواڑ کے تحائف کے ذکر کے سوا اس کی باقی سرگزشت بے توجہی سے سنی لیکن جب اس نے یہ بتایا کہ اسے ڈاکوؤں سے بچا کر یہاں پہنچانے والے سراندیپ کے جہاز ہیں تو اس نے چونک کر سوال کیا "کیا یہ جہاز وہی تو نہیں جن پر سراندیپ کے راجہ نے عربوں کو ہاتھی بھیجے ہیں؟"

"ہاں! لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو! اس پر عرب بچے اور عورتیں بھی ہیں؟"

"ہاں!"

"یہ جہاز بحری ڈاکوؤں کے دو جہازوں کو ڈبو چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے

کہ وہ اچھی طرح مسلح ہیں۔ وہ بندرگاہ سے روانہ تو نہیں ہو گئے؟"

"نہیں! میں مسافروں کو اپنے پاس ایک دو دن مہمان رکھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھ پر بہت احسان کیے ہیں۔ میں آپ سے یہ پوچھنے آیا تھا کہ آپ کو ان کے شہر میں ٹھہرنے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"اعتراض! نہیں۔ وہ باقی تمام عمر ہمارے مہمان رہیں گے۔ میں مہاراج سے ان کے جہاز لوٹنے اور انھیں گرفتار کرنے کی اجازت حاصل کر چکا ہوں۔"

اگر اس محل پر بجلی گر پڑتی، تو بھی شاید جے رام اس قدر بدحواس نہ ہوتا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے ایک بے جان مجسّمہ کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے سنبھل کر کہا۔ "آپ مذاق کرتے ہیں؟"

پرتاپ رائے نے ذرا تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "میں بچوں کے ساتھ مذاق کرنے کا عادی نہیں۔ ہمیں سندھی تاجروں سے ان جہازوں کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی اور مہاراج کا حکم یہی ہے کہ ان جہازوں کو چھین لیا جائے۔ مہاراج تحائف کا یہ صندوق دیکھنے سے زیادہ اس بات سے خوش ہوں گے کہ آپ مال و متاع سے بھرے ہوئے دو جہاز یہاں لے آئے ہیں۔"

جے رام نے چلّا کر کہا۔ "نہیں! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ میرے مہمان ہیں۔ وہ میرے دوست اور محسن ہیں۔"

پرتاپ رائے نے ڈانٹ کر کہا۔ "ہوش سے بات کرو۔ تمھیں معلوم نہیں تم کہاں کھڑے ہو؟"

جے رام نے کہا۔ "یہ انسانیت کے خلاف ہے۔ تم ایک ایسی قوم کی دشمنی مول لو گے جو سندھ جیسی کئی سلطنتیں پاؤں تلے روند چکی ہے۔ مہاراج کو اس قسم کا مشورہ دینے والے نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں جاتا ہوں۔ مہمان کی رکھشا ایک راجپوت

کا دھرم ہے۔"

"راجہ کے باغی ہوکر تم کہیں نہیں جاسکتے۔" یہ کہتے ہوئے پرتاپ رائے نے پہرہ داروں کو آواز دی اور آن کی آن میں چار سپاہیوں نے ننگی تلواروں سے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

جے رام کو اپنی تلوار بے نیام کرنے کا موقع نہ ملا۔ پرتاپ رائے نے کہا "تمھیں کچھ دیر میری قید میں رہنا پڑے گا۔ بندرگاہ سے واپس آکر میں تمھیں آزاد کردوں گا۔ کل تمھیں مہاراج کے پاس روانہ کر دیا جائے گا۔ اگر تم اپنے مہمانوں کی جاں بخشی کروا سکو، تو میں انھیں رہا کردوں گا لیکن تمھاری خوشی کے لیے میں راجہ کے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتا۔"

سپاہیوں نے جے رام کو محل کی ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ جے رام دروازے کو دھکے دینے، دیواروں سے سر پٹخنے اور شور مچانے کے بعد خاموش ہوکر بیٹھ گیا۔ اسے اپنی بہن کا خیال آیا، اور وہ پھر اٹھ کر دروازے سے ٹکریں مارنے لگا۔ اس نے تلوار نکالی لیکن مضبوط کواڑ پر چند ضربیں لگانے کے بعد وہ بھی ٹوٹ گئی۔ اس نے ٹوٹے ہوئے پھل کی نوک اٹھا کر اپنے سینے میں گھونپنے کا ارادہ کیا لیکن کسی خیال نے اس کا ہاتھ روک لیا وہ اٹھ کر بیقراری سے کوٹھری میں ٹہلنے لگا۔ پھر اسے ایک خیال آیا اور اس نے پہرہ داروں کو آوازیں دیں۔ انھیں طرح طرح کے لالچ دیے لیکن کسی نے اس کے حال پر توجہ نہ دی۔ اس نے راجہ کے پاس شکایت کرنے کی دھمکیاں دیں، لیکن جواب میں پہرہ داروں کے قہقہے سنائی دیے۔

(۲)

جے رام کے شہر جانے سے کچھ دیر بعد گنگو اور اس کے تین ساتھی شام کے دھندلکے

میں زبیر سے رخصت ہوکر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی انھیں پندرہ بیس سوار اور ان کے پیچھے قریباً ڈیڑھ سو پیدل سپاہی بندرگاہ کا رخ کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ گنگو کا ماتھا ٹھنکا اور وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ سوار اور پیدل گزر گئے تو گنگو نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "شہر کا سردار مسلح سپاہی لے کر بندرگاہ کی طرف جا رہا ہے۔ ان کی رفتار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نیّت ٹھیک نہیں ہمیں واپس چلنا چاہیئے۔"

کالو نے کہا "اگر وہ واقعی کسی بری نیّت سے جا رہے ہیں تو ہم لوٹ کر کیا کر سکتے ہیں انھیں تو جہازوں کے لنگر اٹھانے اور بادبان کھولنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ ہمیں اپنی فکر کرنی چاہیئے۔"

گنگو نے کہا۔ "اگر تم میرا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہو تو تمھاری مرضی۔ لیکن میں ضرور جاؤں گا۔ اور واسو، موتی، تم بھی اگر چاہو تو جا سکتے ہو۔"

ان دونوں نے یک زبان ہوکر کہا "نہیں ہم تمھارے ساتھ ہیں۔"

کالو نادم سا ہوکر بولا۔ "میں بھی آپ کے ساتھ ہوں، لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

گنگو نے جواب دیا۔ "یہ ہم وہاں پہنچ کر دیکھیں گے۔"

موتی نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ جے رام نے اپنے محسنوں کو دھوکا دیا ہے۔"

گنگو نے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے لیکن اگر اس کی نیّت بری ہوتی تو اپنی بہن کو وہاں کیوں چھوڑ جاتا۔"

واسو نے کہا "یہ سمجھنا مشکل نہیں۔ وہ اپنی بہن کو اس لیے ان کے پاس چھوڑ گیا تھا کہ وہ اس کے جانے کے بعد بندرگاہ پر ٹھہرنے کا ارادہ تبدیل نہ کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی بھی اس سازش میں شریک تھی۔ دیکھنے میں وہ کتنی بھولی بھالی ہے وہ جہاز پر اس عرب لڑکی کو اپنی بہن کہا کرتی تھی۔"

گنگو نے کہا" اور جے رام خالد کو چھوٹا بھائی کہا کرتا تھا اور جب زبیر بیمار تھا۔ وہ دن رات اس کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ جھوٹا۔ مکار، دغاباز! کاش وہ میرے ہاتھ پڑ جائے لیکن وہ لڑکی ——— کالو وہ ہمارے ہاتھ سے نہ جائے اسے پکڑ کر ہم بہت سے کام نکال سکتے ہیں۔ چلو جلدی کرو۔ یہ باتوں کا وقت نہیں۔"

گنگو اور اس کے ساتھی پوری رفتار سے بندرگاہ کی طرف بھاگنے لگے۔

(۳)

عرب ملاح جہاز پر نماز مغرب ادا کرنے کے بعد دعا کر رہے تھے کہ دلیپ سنگھ نے اپنے جہاز سے ان کے جہاز پر پہنچ کر انھیں بندرگاہ کی طرف متوجہ کیا۔ زبیر اور اس کے ساتھی ساحل پر مسلح سپاہی دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ چار آدمی ایک کشتی میں سوار ہو کر جہاز پر پہنچے اور ان میں سے ایک نے سندھی زبان میں کہا۔ "دیبل کے حاکم سردار پرتاپ رائے آپ لوگوں کو خوش آمدید کہتے ہیں وہ ان جہازوں کے افسروں سے ملنا چاہتے ہیں۔"

دلیپ سنگھ نے پرتاپ رائے کے پیام رساں سے پوچھا "لیکن جے رام کہاں ہے؟"

اس نے جواب دیا "وہ مہاراج پرتاپ رائے سے مل کر آپ لوگوں کی دعوت کا انتظام کرنے کے لیے اپنی قیام گاہ پر چلے گئے ہیں۔ مہاراج خود آپ کے استقبال کے لیے آئے ہیں۔"

دلیپ سنگھ نے زبیر سے عربی میں کہا۔ "یہ ضرور کوئی فریب ہے لیکن ہمارے لیے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

زبیر نے جواب دیا "میں خود حیران ہوں کہ دیبل کا حکمران اتنے سپاہی ساتھ

لے کر کیوں آیا ہے لیکن مجھے جے رام سے فریب کی توقع نہیں۔ اس کی بہن اس جہاز پر ہے۔"

ایلچی نے پھر پوچھا "میں مہاراج کے پاس کیا جواب لے جاؤں؟"

زبیر نے کہا "ہم تمھارے ساتھ چلتے ہیں۔"

زبیر اور دلیپ سنگھ کشتی میں سوار ہو کر ساحل پر پہنچے۔ دلیپ سنگھ پرتاپ رائے کے سامنے جھک کر آداب بجا لایا، لیکن زبیر کی گردن میں خم نہ آنے پر پرتاپ رائے نے کہا "تو تم عرب کے باشندے ہو۔ تم میں سے کسی کو بڑوں کا ادب کرنا نہیں آتا؟"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا "ان کے مذہب میں انسان کے آگے جھکنا پاپ ہے۔"

پرتاپ رائے نے جواب دیا "ہمارے پاس رہ کر انھیں انسانوں کے سامنے جھکنا بھی آجائے گا۔"

دلیپ سنگھ نے پوچھا "آپ کا مطلب؟"

پرتاپ رائے نے جواب دیا "کچھ نہیں تمھارے جہازوں پر کیا ہے؟"

دلیپ سنگھ نے کہا "جے رام نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ آپ ہم سے کیوں پوچھتے ہیں؟"

"جے رام نے جو کچھ بتایا ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ جہاز یہاں سے نہیں جا سکتے۔"

"جہاز یہاں سے نہیں جا سکتے۔ وہ کیوں؟"

"یہ راجہ کا حکم ہے۔"

دلیپ سنگھ نے چاروں طرف دیکھا، زبیر اور اس کے گرد مسلح سپاہیوں کا گھیرا تنگ ہو چکا تھا۔ اس نے عربی زبان میں زبیر کو صورتِ حالات سے آگاہ کیا اور زبیر کے سمجھانے پر وہ پرتاپ رائے سے مخاطب ہوا:-

"یہ سندھ کے نادار ملاحوں کی کشتیاں نہیں جن پر آپ دستِ درازی کر سکیں، یہ عربوں کے جہاز ہیں۔ ان پر اس قوم کی بیٹیاں سوار ہیں جو سرکشوں اور باغیوں کے مقابلے میں آندھی کی طرح اٹھتی ہے اور بادل کی طرح چھا جاتی ہے جو آسمان سے بجلیاں گرتی دیکھ کر نہیں ڈرتے، وہ ان کی تلوار سے پناہ مانگتے ہیں۔"

پرتاپ رائے نے غضب ناک ہو کر تلوار نکال لی۔ دلیپ سنگھ اور زبیر نے تلواریں کھینچنے کی کوشش کی لیکن کئی ننگی تلواریں اور چمکتے ہوئے نیزوں نے ان کے ہاتھ روک لیے۔ پرتاپ رائے نے کہا "تم سندھی معلوم ہوتے ہو لیکن تمھاری رگوں میں کسی بزدل غدار اور کمینے آدمی کا خون ہے۔"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا "دنیا میں سب سے بڑی غداری اور کمینگی اپنے مہمان کو دھوکا دینا ہے اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ تم ......"

دلیپ سنگھ کا فقرہ پورا نہ ہوا تھا کہ پرتاپ رائے کی تلوار کی نوک اس کے سینے میں اتر گئی اور وہ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ زبیر نے جھک کر اسے ہاتھوں کا سہارا دیا۔ اس نے ایک جھرجھری لے کر زبیر کی طرف دیکھا اور کہا "زبیر! تمھارے ساتھ میرا سفر ختم ہوا۔ میں دل پر ایک بھاری بوجھ لے کر جا رہا ہوں۔ میں جہالت کی گود میں پلا۔ ابوالحسن نے مجھے انسان بنایا اور تم نے میرے دل میں اسلام کے لیے ایک تڑپ پیدا کی لیکن نہ معلوم کیوں میں اب تک اپنے ضمیر کی آواز بلند کرنے سے جھجکتا رہا۔ میں لوگوں کی نظروں سے چھپ کر نمازیں پڑھ چکا ہوں۔ روزے رکھ چکا ہوں لیکن اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنے سے جھجکتا رہا، اب میں ارادہ کر رہا تھا کہ بصرہ پہنچ کر مسلمان ہونے کا اعلان کروں، لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ مجھے ناہید کا افسوس ہے۔ خدا اسے بے رحم دشمن کے ہاتھوں سے بچائے۔ میرے دوست! مجھے ... بھول نہ جانا! میرے لیے دعا کرنا!!"

دلیپ سنگھ نے پھر ایک جھرجھری لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند بار کلمۂ توحید دہرایا۔ اس کی آواز خفیف اور مدھم ہوتی گئی۔ ہونٹ کپکپائے، بھنچے اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ بصرہ کے مسافر کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کسی ایسی منزل کو دیکھ رہی تھیں جس کے مسافر واپس نہیں آتے۔ دلیپ سنگھ دائمی نیند کی گود میں جا چکا تھا۔ زبیر نے "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہا اور دلیپ سنگھ کا سر زمین پر رکھ کر حقارت سے پرتاپ رائے کی طرف دیکھنے لگا۔

سپاہی کشتیوں پر سوار ہو کر تیر برساتے ہوئے جہازوں کا رخ کر رہے تھے اور جہازوں سے تیروں کا جواب تیروں میں آ رہا تھا۔ زبیر کے لیے فرار کی تمام راہیں بند تھیں۔ پرتاپ رائے کے اشارے سے آٹھ دس سپاہی اس پر پل پڑے اور اسے رسیوں سے جکڑ کر زمین پر ڈال دیا۔ زبیر حسرت سے اپنے جہازوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

(۴)

جہاز پر ناہید کے علاوہ دوسری عرب عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ لڑ رہی تھیں۔ ہاشم دیر تک دوسرے بچوں کے ساتھ ایک کونے میں چھپ کر نہ بیٹھ سکا وہ اوپر آکر خالد کے قریب کھڑا ہو گیا اور پوچھنے لگا "ہمیں کتنی بار بحری ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنا پڑے گا؟"

خالد نے کمان میں تیر چڑھاتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ ہاشم کے قریب مایا دیوی حیران و ستشدر کھڑی تھی۔ اس نے کہا "مایا دیوی! تم ہاشم کو نیچے لے جاؤ!"

مایا دیوی ہاشم کو اٹھا رہی تھی کہ ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور ہاشم کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ مایا دیوی نے بھاگ کر اسے ایک کونے میں لٹا دیا اور تیر نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہاشم ایک ہلکی سی آہ اور معمولی سی کپکپاہٹ کے بعد ٹھنڈا ہو گیا مایا دیوی سسکیاں لیتی ہوئی

اٹھی، لیکن پیچھے سے ایک مضبوط ہاتھ کی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گئی۔"

"کون ہے گنگو!" اس نے چاند کی دھیمی روشنی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! میں ہوں۔ کالو! اٹھا لو اسے، اگر شور مچائے تو گلا گھونٹ دینا۔"

کالو مایا دیوی کو اٹھا کر جہاز کی پچھلی طرف رسی کی ایک سیڑھی سے اتر کر ایک کشتی پر سوار ہو گیا۔

گنگو نے آگے بڑھ کر خالد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اب مقابلہ کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ان کی تعداد ہم سے بہت زیادہ ہے اور عقب سے بھی دو جہاز ہم پر حملہ کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ میری کشتی جہاز کے پیچھے کھڑی ہے۔ میں تمھیں اور ناہید کو بچا سکتا ہوں۔"

خالد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "ہم اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔"

"لیکن تم نہیں جانتے کہ وہ لوگ تمھاری بہن کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔"

"لیکن میں جہاز کی تمام عورتوں کو اپنی بہنیں سمجھتا ہوں، اب جے رام کی دغابازی نے مجھے کسی پر اعتماد نہیں رہا۔"

ایک تیر ناہید کو لگا اور وہ پسلی پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ خالد نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن اس نے کہا "میں ٹھیک ہوں۔ خالد! تم میری فکر نہ کرو۔"

خالد نے اس کے اصرار کے باوجود اسے اٹھا کر ہاشم کے قریب بٹھا دیا، ہاشم کی لاش دیکھ کر ناہید کو اپنا زخم بھول گیا۔ اس نے ہاشم کو جھنجھوڑا، آوازیں دیں اور انتہائی کرب کی حالت میں بولی۔ "ہاشم تم اوپر کیوں آئے؟"

گنگو نے بے خبری کی حالت میں ناہید کی پسلی سے تیر نکال کر پھینک دیا اور واسو

سے کہا "اسے اٹھا لو!"

واسو ناہید کو اٹھانے کے لیے جھکا لیکن خالد نے آگے بڑھ کر اسے پیچھے دھکیل دیا اور کہا "تم جے رام اور یہ سپاہی مختلف راستوں سے آئے تھے لیکن تم سب کا مقصد ایک ہے۔ جاؤ ہم تمھیں ایک دفعہ معاف کر چکے ہیں۔"

گنگو نے کہا "بیٹا! اگر باتوں کے لیے وقت ہوتا، تو میں تمھارا شک دور کرنے کی کوشش کرتا لیکن ہم پر دشمن کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے اور اگر ہم نے چند اور لمحات ضائع کر دیے تو بھاگنے کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔ افسوس میں تمھیں سوچنے کی مہلت بھی نہیں دے سکتا۔ بیٹے! مجھے معاف کرنا۔" یہ کہتے ہوئے گنگو نے اچانک ایک چھوٹا سا ڈنڈا خالد کے سر پر دے مارا۔ خالد لڑکھڑایا لیکن گنگو نے اٹھا کر اسے کندھے پر رکھ لیا۔ واسو نے ناہید کو اٹھا لیا اور گنگو نے موتی سے کہا "تم یہ کمانیں اٹھا لو، یہ ہمیں کام دیں گی۔"

حملہ آور کمندیں ڈال کر جہازوں پر سوار ہو رہے تھے اور تیروں کی لڑائی تلواروں کی لڑائی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس ہنگامے میں کسی کو ناہید، خالد اور مایا دیوی کے اغوا کیے جانے کا پتہ نہ چلا۔ جب تک یہ لوگ کشتی پر سوار ہوئے، چند کشتیاں عقب سے بھی جہازوں کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ گنگو اور اس کے ساتھیوں نے سندھی زبان میں ہاؤ ہو کر کے حملہ آوروں کو شک نہ ہونے دیا اور بچتے بچاتے جہازوں سے ایک طرف نکل گئے۔

گنگو کے کہنے پر مایا دیوی نے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر ناہید کے زخم پر پٹی باندھ دی۔ خالد کو اپنے ساتھ دیکھ کر اب اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ گنگو پانی سے کپڑا بھگو بھگو کر خالد کے ماتھے پر رکھ رہا تھا اور مایا دیوی کو وہ شخص جو چند لمحے پیشتر ایک بدترین دشمن کی صورت میں نمودار ہوا تھا ایک غمگسار نظر آ رہا تھا۔

کشتی خطرے کی حد سے دور آچکی تھی اور مایا گنگو سے ہم کلام نہ ہونے کا ارادہ کرنے کے باوجود بار بار یہ پوچھ رہی تھی۔ "اسے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ یہ کیسے بیہوش ہوا؟"

ناہید انتہائی رنج و ملال کی وجہ سے کسی سے ہم کلام نہ ہوئی۔ وہ تشویش کی حالت میں اپنے بھائی کی طرف دیکھتی اور جب گنگو یہ کہتا۔ "بیٹی! تم فکر نہ کرو تمھارے بھائی کو ابھی ہوش آجائے گا۔ میں تمھارا دشمن نہیں۔ میں سمندر کے دیوتا کی قسم کھاتا ہوں۔" تو ناہید خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

پھر وہ مایا دیوی سے مخاطب ہوا۔ "مایا! تم ایک راجپوت لڑکی ہو۔ راجپوت جھوٹی قسمیں نہیں کھاتے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں، کیا تمھیں یہ شبہ تھا کہ تمھارا بھائی ان لوگوں کو دھوکا دے گا؟"

"نہیں! نہیں!! میرا بھائی ایسا نہیں۔ میں بھگوان کی قسم کھاتی ہوں۔"

"اور اگر یہ ثابت ہوگیا تو؟"

"تو میں ...... میں کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں گی۔ آگ میں جل جاؤں گی۔ اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ ڈالوں گی۔ بھگوان کے لیے ایسا نہ کہو۔" مایا دیوی کی ہچکیوں نے ناہید کو متاثر کیا اور اس نے کہا۔ "مایا! تم ان باتوں کی پروا نہ کرو۔ مجھے تم پر یقین ہے اور اگر تمھارے بھائی نے ہمارے ساتھ دھوکا بھی کیا ہو تو اس میں تمھارا کیا قصور؟"

"میں پھر کہتی ہوں میرا بھائی ایسا نہیں۔ اس کی رگوں میں ایک راجپوت کا خون ہے وہ اس قدر احسان فراموش نہیں ہوسکتا۔"

ناہید نے کہا۔ "اس وقت ہمارا دشمن وہ ہے جس نے ہمیں زبردستی جہاز پر سے اتارا ہے اور ہمیں کسی نامعلوم جگہ پر لے جا رہا ہے۔"

گنگو نے کہا۔ "بیٹی! کاش میں تمام بچوں اور عورتوں کو اپنے ساتھ لا سکتا لیکن اس کشتی پر صرف اتنی سواریوں کی جگہ تھی۔ تم نوجوان ہو اور میں تمھیں ایک بے رحم دشمن کے ہاتھوں سے بچانا چاہتا ہوں اور مایا دیوی! تم شاید باقی سب کو بچا سکو۔ میں تمھاری آزادی کے بدلے باقی لوگوں کو آزاد کروانا چاہتا ہوں۔"

خالد نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں اور حیران ہو کر سب کی طرف دیکھا۔ گذشتہ واقعات یاد آتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور دکھتے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "ہمارا جہاز کہاں ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ گنگو! گنگو!! ظالم! دغا باز فریبی! تم نے ہمارے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟ وہ کیا کہیں گے۔ تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟"

گنگو نے ٹھنڈے دل سے جواب دیا۔ "خالد! یہ میری عمر میں پہلا موقع ہے کہ مجھے کسی کی گالی پر غصہ نہیں آیا۔ تم مجھے جو جی میں آئے کہو لیکن میں نے برا نہیں کیا۔ میں صرف مایا کو لینے آیا تھا لیکن تمھاری بہن کو زخمی دیکھ کر یہ گوارا نہ کر سکا کہ اسے دشمن کے رحم پر چھوڑ دوں۔"

خالد نے حقارت سے مایا دیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اب سمجھا جے رام نے ایک طرف سے ہم پر حملہ کرنے کے لیے سپاہی بھیج دیے اور دوسری طرف سے تمھیں مایا دیوی کو لینے کے لیے بھیج دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لٹیروں کے سردار تم نہ تھے جے رام تھا۔"

"تم درست کہتے ہو لیکن میں توبہ کر چکا ہوں اور جے رام نے توبہ نہیں کی۔ ممکن ہے وہ اپنی بہن کی خبر سننے کے بعد توبہ کرے۔"

"تو تم ہمیں اس کے پاس نہیں لے جا رہے ہو۔"

"تم دیکھ سکتے ہو بندرگاہ کس طرف ہے اور ہم کس طرف جا رہے ہیں؟"

"تو تم ہمیں کہاں لے جاؤ گے؟"

"کسی ایسی جگہ جہاں راجہ کے سپاہی نہ پہنچ سکیں۔"

خالد نے کہا۔ "اگر تمھاری نیت بری نہیں تو ہمیں اپنے ساتھیوں کے پاس چھوڑ آؤ!"

گنگو نے کہا۔ "تمھارے ساتھی تھوڑی دیر میں دیبل کے قیدخانے میں ہوں گے۔ تم قید ہونے کی بجائے قید سے باہر رہ کر ان کی زیادہ مدد کر سکتے ہو۔"

خالد نے قدرے پُرامید ہو کر پوچھا۔ "تم سچ مچ ان کی مدد کرنا چاہتے ہو؟"

گنگو نے جواب دیا۔ "بیٹا! مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر میں تمھارا دشمن ہوتا تو یقیناً اس قدر ٹھنڈے دل سے یہ گالیاں نہ سنتا۔"

اگلے دن یہ کشتی دریائے سندھ کے دہانے پر پہنچ گئی۔ گنگو کو اپنے ساتھی مچھلیاں پکڑتے ہوئے مل گئے۔

قیدی

اگلے دن کوٹھڑی کا دروازہ کھلا، اور پہریدار نے جے رام کو ہاتھ باندھ کر پرنام کیا اور کہا۔ "آپ کو سردار پرتاپ رائے بلاتے ہیں۔"

جے رام پہریدار کے طرزِ عمل میں اس تبدیلی پر حیران تھا وہ چپکے سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ پرتاپ رائے اپنے دیوان خانے کے برآمدے میں آبنوس کی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے چاندی کے ایک طشت میں سراندیپ کے راجہ کے وہ تحائف پڑے ہوئے تھے، جو گزشتہ شام عربوں کے جہاز سے لوٹے گئے تھے۔

اس نے جے رام کو دیکھتے ہی جواہرات کے انبار کی طرف اشارہ کیا اور کہا "جے رام! مہاراج سراندیپ کے تحائف دیکھ کر کاٹھیا واڑ کے راجہ کے تحائف کی نسبت زیادہ خوش ہوں گے۔ ان میں ایک ایک ہیرا تمھارے صندوق کے سارے مال سے زیادہ قیمتی ہے۔"

جے رام نے اس پر قہر آلود نگاہ ڈالی اور اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

پرتاپ رائے نے کہا۔ "لیکن تمھارا چہرہ زرد اور تمھاری آنکھیں سرخ ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے تم رات بھر نہیں سوئے۔ کوٹھری میں بہت گرمی ہوگی۔ بندرگاہ سے واپس آکر مجھے تمھارا خیال نہ آیا۔ ورنہ تمھیں اتنی دیر وہاں رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے مہاراج کی خدمت میں ایلچی بھیج دیا ہے۔ چند دنوں تک قیدیوں کے متعلق ان کا حکم آجائے گا۔"

جے رام نے کہا "تو آپ نے انھیں قید کر لیا؟"

"ہاں! میں نے تمھیں کل بھی بتایا تھا کہ یہ راجہ کا حکم ہے۔"

"آپ نے انھیں لڑ کر قید کیا یا میزبان بن کر؟"

پرتاپ رائے نے جواب دیا۔ "تم ابھی بچے ہو۔ لڑائی میں سب کچھ جائز ہے۔"

"میری بہن کہاں ہے؟"

"کون؟"

"میری بہن"

"کہاں تھی؟"

"آپ مجھے بنانے کی کوشش نہ کریں۔ ایک راجپوت کی عزت پر ہاتھ ڈالنا اس قدر آسان نہیں جس قدر آپ سمجھتے ہیں۔ میں پہلے آپ کے راجہ کا ملازم تھا اور اب میں کاٹھیاواڑ کے راجہ کے سفیر کی حیثیت میں یہاں آیا ہوں۔ اگر آپ نے میری بہن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو یاد رکھیے میں کاٹھیاواڑ سے لے کر راجپوتانہ تک آگ کی دیوار کھڑی کر دوں گا اور مہاراج اپنے ہزاروں سپاہیوں کی جانیں ضائع کرنے کے بجائے دیبل کے ایک مغرور حاکم کو ہمارے حوالے کر دینا زیادہ مناسب سمجھیں گے۔ رہے عرب وہ مہمان تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ میری وجہ سے اس مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ ممکن ہے کہ ان کے متعلق میری پکار ہندوستان کے کسی گوشے میں نہ سنی جائے لیکن ان کے بازو بہت لمبے ہیں۔ وہ

جب چاہیں گے آپ کا گلا دبوچ لیں گے۔"

پرتاپ رائے کو معلوم تھا کہ بعض اوقات راجہ کے غلط احکام بجا لانے کا خمیازہ اہلکاروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ حاکم خطرے کے وقت اپنا قصور اہل کاروں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ عربوں کے متعلق وہ اپنے راجہ کی طرح مطمئن تھا لیکن وہ کاٹھیاواڑ کے سفیر کی بہن کی ذمہ داری لینے کو تیار نہ تھا۔ اس نے کہا "جے رام! مجھے تمھاری بہن کے متعلق کوئی علم نہیں۔"

"آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ میں اسے جہاز پر عرب عورتوں کے پاس چھوڑ آیا تھا۔"

"عورتیں جو جہاز پر تھیں وہ سب ہماری قید میں ہیں۔ اگر تمھاری بہن ان میں ہے تو میں ابھی تمھارے ساتھ چل کر اس سے معافی مانگتا ہوں۔ چلو!"

بہن کو تلاش کرنے کی خواہش جے رام کے تمام ارادوں پر غالب آگئی، اور وہ پرتاپ رائے کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں اس نے پوچھا۔ "عرب ملاحوں کے ساتھ آپ نے کیا سلوک کیا؟"

پرتاپ رائے نے جواب دیا۔ "وہ سب آخری وقت تک لڑتے رہے۔ عورتوں اور بچوں کے علاوہ ہم صرف پانچ آدمیوں کو زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ دوسرے جہاز پر سراندیپ کے ملاحوں نے معمولی مزاحمت کی لیکن جلد ہی ہتھیار ڈال دیے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بیک وقت سراندیپ اور عرب کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔"

"میں نے صرف راجہ کے احکام کی تعمیل کی ہے اور جب تک میں اس عہدے پر ہوں، میں ایسے احکام کی تعمیل کرتا رہوں گا۔ میرے خط کے جواب میں راجہ نے اگر

تمھیں بلا بھیجا اور تم نے ان سے قیدیوں کو رہا کرنے کی اجازت حاصل کرلی، تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں خواہ مخواہ کی ذمہ داری سے بچ جاؤں گا۔"

محل سے نکل کر چند قدم کے فاصلے پر جے رام اور پرتاپ رائے قید خانے کی چار دیواری میں داخل ہوئے۔ پہرہ داروں نے پرتاپ رائے کا اشارہ پاکر عربوں کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ عورتوں نے اپنے چہرے ڈھانپ لیے۔ عرب ملاحوں نے جے رام کو دیکھتے ہی منہ پھیر لیے۔ زبیر ایک کونے میں دیوار کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے نفرت اور حقارت سے جے رام کی طرف دیکھا اور اپنے ساتھیوں کی طرح منہ پھیر لیا۔

جے رام نے پرتاپ رائے کی طرف دیکھا اور کہا "میری بہن یہاں نہیں، وہ کہاں ہے؟"

پرتاپ رائے نے ایک پہرہ دار کو آواز دے کر اندر بلایا اور اس سے پوچھا۔ "کیا تمام عورتیں اسی کمرے میں ہیں یا سراندیپ کے ملاحوں کے کمرے میں بھی کوئی ہے؟"

"نہیں مہاراج! تمام عورتیں یہیں ہیں۔"

جے رام نے بدحواس سا ہو کر زبیر کی طرف دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی عربی میں کہا۔ "زبیر! میری طرف اس طرح نہ دیکھو! میں بے قصور ہوں۔ تمھیں معلوم ہے۔ میری بہن کہاں ہے؟"

زبیر کے منہ سے اچانک ایک بھوکے شیر کی گرج سے ملتی جلتی آواز نکلی۔ "تم میری توقع سے کہیں زیادہ ذلیل ثابت ہوئے ہو۔ تم جھوٹ سے حقیقت پر پردے نہیں ڈال سکتے لیکن یاد رکھو، اگر ناہید کا بال بھی بیکا ہوا، تو خدا کی زمین پر تمھیں کوئی ایسا خطہ نہیں ملے گا جو ہمارے انتقام سے پناہ دے سکے۔ ناہید کو اڑانے کے لیے

تم نے اپنی بہن کو جہاز پر چھوڑا تھا۔ تمھاری تدبیر کامیاب تھی۔ تم نے اپنے اس حلیف کو ہمارا میزبان بنا کر بھیجا اور مجھے جہاز سے بلوالیا اور خود پیچھے سے جہاز پر پہنچ کر نہ معلوم کس بہانے سے ناہید کو کہیں لے گئے لیکن اگر صلح اور جنگ کے لیے تم لوگوں کے اصول یہی ہیں تو یاد رکھو کہ تمھارے راجہ کے دن گنے جا چکے ہیں۔"

پرتاپ رائے نے اچانک سپاہی کے ہاتھ سے کوڑا چھین کر زبیر کے منہ پر دے مارا اور دوسری ضرب کے لیے تیار تھا کہ جے رام نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پرتاپ رائے نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم راجہ کی توہین برداشت کر سکتے ہو، میں نہیں کر سکتا۔"

جے رام نے کہا۔ "میں تم سے آخری بار پوچھتا ہوں کہ میری بہن اور اس عرب لڑکی کو تم نے کہاں چھپایا ہے؟"

اس سوال نے پرتاپ رائے کا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے حملے کے وقت اسے انتقامی جذبے کے ماتحت جہاز سے نیچے پھینک دیا گیا ہو۔"

جے رام نے جواب دیا۔ "یہ لوگ دشمنی میں شرافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے میری بہن کے ساتھ عرب لڑکی کا غائب ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس سازش کی تہ میں کسی تمھارے جیسے کمینے آدمی کا دماغ کام کر رہا ہے۔"

زبیر نے پھر جے رام سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم ان باتوں سے مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ ناہید، خالد اور تمھاری بہن بیک وقت جہاز سے غائب ہوئے ہیں اور وہ یقیناً تمھاری قید میں ہیں۔ مجھے تم سے کسی نیکی کی توقع نہیں لیکن ہم اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ ہمیں سندھ کے راجہ کے سامنے پیش کیا جائے اور جب تک وہ ہمارا فیصلہ نہیں کرتا، ناہید اور خالد کو ہمارے ساتھ رکھا جائے۔"

پرتاپ رائے نے چونک کر کہا "میں اب سمجھا جے رام! اگر ان لڑکیوں کے ساتھ جہاز پر سے کوئی آدمی بھی غائب ہوا ہے تو یہ معاملہ صاف ہے۔ کل رات بندرگاہ سے ایک سرکاری کشتی بھی غائب ہوگئی ہے لیکن وہ زیادہ دور نہیں جا سکتے۔ تم میرے ساتھ آؤ!"

پرتاپ رائے اور جے رام قید خانے سے باہر نکل کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور انھیں سرپٹ دوڑاتے ہوئے بندرگاہ پر پہنچے۔ بندرگاہ کے پہریداروں نے شام کے وقت کشتی غائب ہوجانے کے متعلق پرتاپ رائے کے بیان کی تصدیق کی، اور مایا کے متعلق جے رام کی تشویش بڑھنے لگی۔ پرتاپ رائے نے چند کشتیاں اور جہاز شمال اور مغرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ دیکھ بھال کے لیے روانہ کر دیے اور جے رام کو تسلی دی کہ وہ زیادہ دور نہیں جا سکتے۔ جے رام پرتاپ رائے کے ساتھ واپس شہر چلا آیا۔

سہ پہر تک اپنے مکان میں مایا کے متعلق کوئی خبر نہ پاکر اس نے بندرگاہ پر جانے کا ارادہ کیا لیکن پرتاپ رائے کا سپاہی آیا اور اسے اپنے ساتھ اس کے محل کی طرف لے گیا۔

(۲)

پرتاپ رائے کے محل کے پائیں باغ میں زبیر اور علی ناریل کے دو درختوں کے ساتھ جکڑے ہوئے تھے۔ پرتاپ رائے، اس کے چند سپاہی اور دو جلاد ہاتھ میں کوڑے لیے ان کے پاس کھڑے تھے۔ علی اور زبیر کی جھکی ہوئی گردنیں اور عریاں سینوں پر ضربوں کے نشانات یہ ظاہر کر رہے تھے کہ انھیں ناقابلِ برداشت جسمانی اذیت پہنچائی جا چکی ہے۔ ایک سپاہی نے جے رام کی آمد کی اطلاع دی،

اور پرتاپ رائے کا اشارہ پاکر جلاد زبیر اور علی پر کوڑے برسانے لگے۔ زبیر ایک چٹان کی طرح کھڑا تھا لیکن علی کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی اور کوڑے کی ہر ضرب کے ساتھ اس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔

باہر کے دروازے میں پاؤں رکھتے ہی علی کی چیخ پکار نے جے رام کو متوجہ کیا اور اس نے بھاگ کر دونوں جلادوں کو یکے بعد دیگرے پیچھے دھکیل دیا اور پرتاپ رائے کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔ "یہ ظلم ہے۔ یہ پاپ ہے۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ نے ان کا فیصلہ راجہ پر چھوڑ دیا ہے۔"

پرتاپ رائے نے علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ لڑکا سپاہیوں نے شہر سے تلاش کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمھاری بہن کے ساتھ ہی جہاز پر سے روپوش ہوا تھا، اور اس کے باقی ساتھی شہر کے آس پاس کہیں چھپے ہوئے ہیں۔"

جے رام نے آگے بڑھ کر علی سے پوچھا۔ "تم کہاں تھے؟ میری بہن کہاں ہے؟"
علی نے سراپا التجا بن کر اس کی طرف دیکھا، اور پھر گردن جھکالی۔
جے رام نے کہا۔ "اگر تمھیں مایا دیوی کے متعلق کچھ معلوم ہے تو بتا دو۔ میں تمھیں بچا سکتا ہوں۔"

علی نے دوبارہ گردن اٹھائی اور چلا چلا کر کہنا شروع کیا۔ "مجھے معلوم نہیں، میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے ان کے متعلق معلوم نہیں۔ میں نے جہاز پر سے کودنے سے پہلے انھیں تلاش کیا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیسے غائب ہوئے۔"
جے رام نے پوچھا۔ "تم شہر میں کیسے پہنچے؟"
"میں جہاز سے کود کر سمندر کے کنارے ایک کشتی میں چھپ گیا تھا۔ آج میں شہر پہنچا اور سپاہی مجھے پکڑ کر یہاں لے آئے۔ تم سب ظالم ہو۔ میں نے تمھارا کوئی قصور

نہیں کیا۔"

جے رام نے زبیر کی طرف دیکھا لیکن حیرانی، غصہ، ندامت اور افسوس کے جذبات کے ہیجان میں وہ اس سے مخاطب ہونے کے لیے موزوں الفاظ تلاش نہ کر سکا۔ اس کی آنکھیں ایک بار اٹھیں اور جھک گئیں۔ ہونٹ کپکپاتے اور ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔ اس نے پرتاپ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "آپ انھیں چھوڑ دیں۔ مجھے ان پر کوئی شبہ نہیں۔"

پرتاپ رائے نے کہا۔ "میں انھیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اگر تمھاری بہن جہاز پر تھی تو ان کو یقیناً یہ علم ہوگا کہ وہ کہاں ہے۔ تم شاید اب تک مجھے مجرم خیال کرتے ہو اور میں ان لوگوں کی زبان سے تمھیں یقین دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تمھاری بہن کو ان لوگوں نے چھپا رکھا ہے اور اگر وہ زندہ نہیں تو انھوں نے جہاز پر حملہ ہونے سے پہلے اسے سمندر میں پھینک دیا ہوگا۔ اب یا انھیں اپنے جرم کا اقبال کرنا پڑے گا اور یا تم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمھاری بہن جہاز پر تھی ہی نہیں اور تم نے مجھے مرعوب کرنے کے لیے یہ بہانہ تلاش کیا تھا۔"

پرتاپ رائے نے پھر جلادوں کو اشارہ کیا اور وہ زبیر اور علی پر پھر کوڑے برسانے لگے، جے رام چلایا۔ "ٹھہرو! ٹھہرو!! یہ بے قصور ہیں۔ یہ ظلم ہے۔ انھیں چھوڑ دو۔"

لیکن اس کی چیخ پکار بے اثر ثابت ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک جلاد کے منہ پر گھونسا رسید کیا، لیکن پرتاپ رائے کے اشارے سے چند سپاہیوں نے اسے پکڑ کر پیچھے ہٹا دیا۔ وہ سپاہیوں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے جد و جہد کر رہا تھا۔ علی چیخیں مارنے کی بجائے نیم بیہوشی کی حالت میں آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ زبیر ہر کوڑے کی ضرب کے بعد جے رام کی طرف دیکھتا اور پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ بالآخر علی کے کراہنے کی آواز بند ہو گئی اور گردن اٹھانے اور آنکھیں کھولنے کے لیے زبیر کی طاقت بھی جواب

دے گئی۔

پرتاپ رائے نے ایک سپاہی کو گرم لوہا لانے کا حکم دیا۔ جے رام پھر چلایا۔ "پرتاپ تم ظالم ہو، کمینے ہو۔ مجھے جو سزا چاہو دے لو لیکن ان پر رحم کرو۔"

پرتاپ رائے نے گرج کر کہا۔ "مجھے تمھاری بد زبانی کی پروا نہیں۔ میں تمھارا فیصلہ مہاراج پر چھوڑوں گا لیکن اس وقت ان کی جان میرے قبضے میں ہے۔ میں ان کی آنکھیں نکلوا دوں گا۔ ان کی بوٹیاں نوچ ڈالوں گا۔ یہ ناممکن ہے کہ یہ زندہ بھی رہیں اور تم مہاراج کے پاس جا کر اپنی بہن کے اغوا کیے جانے کی ذمہ داری بھی مجھ پر ڈال لو۔ اگر تمھاری بہن جہاز پر سے غائب ہوئی ہے تو میں ضرور اس کا پتہ لگاؤں گا۔ اس کے لیے اگر مجھے ان تمام بچوں اور عورتوں کے ساتھ یہی سلوک کرنا پڑا تو بھی دریغ نہیں کروں گا۔"

سپاہی نے لوہے کی سلاخ پرتاپ رائے کے ہاتھ میں دے دی اور وہ زبیر کی طرف بڑھا۔ جے رام نے بلند آواز میں کہا۔ "نہیں نہیں!! ٹھہرو! میری بہن جہاز پر نہ تھی۔ میں اکیلا آیا تھا۔ میں فقط ان کی جان بچانا چاہتا تھا۔"

پرتاپ رائے نے جواب دیا "لیکن مجھے کیونکر یقین آئے کہ تم راجہ کے سامنے ایسی کہانیاں بیان کر کے اسے میرے خلاف نہیں بھڑکاؤ گے۔"

"پرتاپ میں وعدہ کرتا ہوں ایک راجپوت کا وعدہ! مجھ پر اعتبار کرو۔"

"تمھیں یہ گواہی بھی دینی پڑے گی کہ جہاز پر سے کوئی بھی لڑکی غائب نہیں ہوئی۔"

"اگر تم انھیں چھوڑ دو تو میں یہ وعدہ کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔"

"انھیں چھوڑنا نہ چھوڑنا راجہ کا کام ہے۔ میں صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ ان کے ساتھ آئندہ کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔ تمھیں راجہ کے سامنے یہ بھی ماننا پڑے گا

کہ تم نے ان لوگوں کو چھڑانے کی نیت سے مجھ پر دباؤ ڈالا اور اپنی بہن کو ایک بہانا بنایا تھا۔"

جے رام نے شکست خوردہ سا ہو کر جواب دیا۔ "میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

پرتاپ رائے نے لوہے کی سلاخ پھینکتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے خواہ مخواہ پریشان کیا۔"

(۳۰)

زبیر نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں۔ وہ علی کے قریب قید خانے میں پڑا ہوا تھا۔ جے رام ٹھنڈے پانی کی بالٹی سے رومال بھگو بھگو کر اس کے زخموں پر ٹکور کر رہا تھا۔ ایک عورت علی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ زبیر ہوش میں آتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جے رام نے پانی کا کٹورا بھر کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ زبیر کے دل میں ایک لمحہ کے لیے پھر ایک بار غصّہ اور حقارت کے جذبات بیدار ہوئے لیکن جے رام کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس نے پانی کے چند گھونٹ پی لیے۔ جے رام نے فقط اتنا کہا۔ "زبیر! مجھے افسوس ہے۔" اور اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

زبیر نے اپنے چہرے پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "جے رام! تم میرے لیے ایک معمّا ہو۔ تم نے دیبل کے حاکم سے ساز باز کر کے ہمیں اس حالت تک پہنچایا۔ اس کے بعد تم میرے لیے جلادوں سے نبرد آزما ہوئے۔ اب تم آنسو بھی بہا رہے ہو آخر ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟"

جے رام کے ہونٹوں سے درد کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔ "زبیر! مجھ پر اعتبار کرو۔ میں تمھارا دوست ہوں۔ تم نے میری جان بچائی تھی اور ایک راجپوت

احسان فراموش نہیں ہو سکتا۔ دیبل کے سردار نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ تمہارے جہازوں پر حملہ کرنے سے پہلے مجھے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ تم مجھ سے بدظن ہو۔ مجھے دغاباز سمجھتے ہو لیکن میں بے قصور ہوں۔ اگر بھگوان نے موقع دیا تو میں یہ ثابت کر سکوں گا۔"

زبیر نے کہا۔ "اگر تم اس سازش میں شریک نہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ ناہید اور خالد کہاں ہیں؟"

جے رام نے جواب دیا۔ "اگر تم مایا کے متعلق کچھ نہیں جانتے تو میں خالد اور ناہید کے متعلق کیا بتا سکتا ہوں ــــ؟ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں ساری رات کوٹھڑی میں بند رہا۔ تم جہاز پر تھے۔ بندرگاہ سے ایک کشتی بھی اس رات غائب ہو چکی ہے۔ اگر تم نے لڑائی سے پہلے انھیں کہیں بھیج دیا ہے، تو بھگوان کے لیے مجھ سے نہ چھپاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے انھیں پرتاپ رائے کے ظالم ہاتھوں سے بچانے کی نیت سے کہیں بھیجا ہو گا۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ مایا زندہ ہے اور کسی محفوظ جگہ پر ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر کوئی آنچ نہ آنے دوں گا۔ میں پرتاپ رائے کو یقین دلا چکا ہوں کہ میری بہن میرے ساتھ نہ تھی۔ ورنہ وہ آج تمھیں زندہ نہ چھوڑتا۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "کاش! میں تم پر اعتبار کر سکتا۔ تم دونوں ناہید کو چھپا کر مایا کی ذمہ داری ہمارے سر اس لیے تھوپ رہے ہو کہ ہم راجہ سے ناہید اور خالد کے متعلق سوال نہ کر سکیں۔"

جے رام نے کہا۔ "زبیر مجھ پر اعتبار کرو۔ مجھے تم سے جھوٹ بولنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو مایا اور ناہید کے متعلق کوئی علم نہیں تو یہ پرتاپ رائے کی شرارت ہے۔ آج وہ میرے سامنے تم دونوں کو اس لیے سزا دے رہا تھا کہ میں آئندہ مایا اور ناہید کا نام نہ لوں۔ میں یہ وعدہ کرتا ہوں اور تم نہیں جانتے

کہ ایک راجپوت بھائی کے لیے اپنی بہن کے متعلق اس قسم کا وعدہ کرنا کس قدر صبر آزما ہے۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "تمھاری مہربانی کا شکریہ۔ اس وقت ہم پر تمھاری تلواروں کا پہرہ ہے۔ ہمارے لیے تمھارے جھوٹ اور سچ سے کوئی فرق نہیں پڑتا میں سچ بولنے کا انعام دے سکتا ہوں۔ نہ جھوٹ بولنے کی سزا۔ صرف یہ جانتا ہوں کہ ہم تمھاری وجہ سے اس مصیبت میں گرفتار ہوئے اور جب تک میں ناہید کو نہیں دیکھتا، مجھے نہ تم پر اعتبار آسکتا ہے اور نہ دیبل کے حاکم پر۔ اگر مستقبل کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ تم اس معاملے میں بے قصور تھے تو میں تم سے اس بدگمانی کے لیے معذرت کر لوں گا۔ اگر دیبل کا حاکم قصوروار ہے تو تمھاری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہماری آواز راجہ کے کانوں تک پہنچ جائے۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو خالد، ناہید اور تمھاری بہن کے متعلق کوئی علم نہیں۔ دوسرے جہاز سے سراندیپ کے ملاحوں نے ہمارے جہاز کے چند آدمیوں کو ایک کشتی پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ وہ کشتی جنوب کی طرف غائب ہوگئی تھی۔ اگر انھیں اس کشتی پر اغوا کیا گیا ہے تو معاملہ صاف ہے۔ کشتی ہمارے جہازوں سے نہیں بلکہ بندرگاہ سے غائب ہوئی ہے اور اس بات کا علم بندرگاہ والوں کو ہونا چاہیئے کہ وہاں سے کشتی کون لایا۔"

جے رام نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "پرتاپ! کمینہ! مکار! ظالم بزدل! ـــــ زبیر بھگوان کے لیے میری خطا معاف کر دو۔ میں نے تم پر شک کیا۔ میں نادم ہوں۔"

زبیر کو ان الفاظ سے زیادہ جے رام کی پُرنم آنکھوں نے متاثر کیا اور اس نے جے رام کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "جے رام! تم جاؤ۔ انھیں تلاش کرو۔ پرتاپ رائے ظالم بھی ہے اور مکار بھی۔ اسے اپنے دل کا حال نہ بتانا۔ ورنہ

تم اپنی بہن کو تلاش نہ کر سکو گے اور نہ راجہ ہی کے کانوں تک یہ خبر پہنچ سکے گی۔"

جے رام اٹھ کر قیدخانے کی کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ پہریداروں نے دروازہ بند کر دیا۔ چند قدم دور جانے کے بعد جے رام نے واپس آکر ایک پہرہ دار کو سراندیپ کے ملاحوں کی کوٹھری کا دروازہ کھولنے کے لیے حکم دیا۔

ان لوگوں سے چند سوالات پوچھنے کے بعد جب وہ باہر نکلا تو اس کے دل پر ایک بھاری بوجھ تھا۔ سراندیپ کے ملاح زبیر کے بیان کی حرف بہ حرف تصدیق کر چکے تھے اور اسے افسوس تھا کہ اسے زبیر کی باتوں پر شک کیوں گزرا۔

مایا کی پریشانی

تین ہفتوں کے بعد ناہید ایک اُجڑے ہوئے قلعے کے ایک کمرے میں بستر پر لیٹی تھی۔ برہمن آباد سے بیس کوس کے فاصلے پر ایک گھنے جنگل میں یہ قلعہ کسی زمانے میں گنگو اور اس کے ساتھیوں کی قیام گاہ تھی۔ چند دنوں سے گنگو اور اس کے ساتھی پھر ان پرانے کھنڈروں کو آباد کر چکے تھے۔

ناہید کے زخم اور بخار سے گنگو کو سخت تشویش تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس نے ناہید کے شفایاب ہونے تک ایسی جگہ کو اپنی قیام گاہ بنایا تھا، جو گردوپیش کے خطرات سے محفوظ تھی۔ گنگو لوٹ مار کی قسم کھا چکا تھا۔ اسے ایک خاص مقصد کے لیے اپنے ساتھیوں کے لیے گھوڑوں اور دوسرے ساز و سامان کی ضرورت تھی۔ جہاز غرق ہو جانے کے بعد اس کے پاس صرف چار بیش قیمت ہیرے رہ گئے تھے۔ جنھیں وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ وہ ایک گجراتی تاجر کا بھیس بدل کر برہمن آباد پہنچا۔ وہاں پر صرف دو ہیرے بیچنے سے اسے اس قدر رقم مل گئی جو اس کے تمام ساتھیوں کو گھوڑے تلواریں اور کھانے پینے کا سامان مہیا کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔

گنگو کو دیبل کے آس پاس اگر کوئی اس قسم کی جائے پناہ مل جاتی تو وہ یقیناً اسے اپنی

سرگرمیوں کا مرکز بناتا لیکن وہاں کوئی موزوں جگہ نہ ہونے کے علاوہ گنگو کو یہ بھی یقین تھا کہ قیدیوں کو برہمن آباد یا اروڑ میں راجہ کے سامنے ضرور پیش کیا جائے گا۔ چند دنوں سے گنگو کے ساتھی دیبل اور برہمن آباد کے درمیان تمام راستوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ گنگو کی نیت کے متعلق خالد کے تمام شکوک رفع ہو چکے تھے۔ مایا دیوی بھی دن رات ناہید کی تیمارداری کر کے گنگو کو کسی حد تک اپنی نیک نیتی کا ثبوت دے چکی تھی۔ ناہید کے شبہات دور کر چکی تھی لیکن خالد پر اس کی کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ اس کے لیے گویا وہ تھی ہی نہیں۔ وہ تیمارداری کے لیے ناہید کے پاس بیٹھتا۔ وہ اس کے سامنے ناہید کے زخم کی مرہم پٹی کرتی۔ اسے دوائی کھلاتی، اس کا سر دباتی اور خالد کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اپنے ارادوں کے خلاف کئی بار یہ الفاظ دہراتی۔ "آپ کی بہن کی طبیعت اب ٹھیک ہے۔ زخم جلد ہی اچھا ہو جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہن ناہید اب تندرست ہے، آپ پریشان نہ ہوں ۔ ۔ ۔ خدا آپ کی مدد کریگا لیکن خالد کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ یہ محسوس کرتی، کہ خالد کی آنکھیں اور کان اس کے لیے بند ہو چکے ہیں۔ دریائے سندھ کے دہانے سے اس مقام تک کشتی کے طویل سفر میں بھی یہی حالت تھی۔ دریا میں وہی پانی تھا، جسے وہ سمندر میں دیکھ چکی تھی۔ ہر صبح وہی سورج نمودار ہوتا اور شام کے وقت انھی چاند اور ستاروں کی محفل سجتی تھی لیکن خالد کے طرزِ عمل میں تبدیلی کے بعد اس کے لیے کائنات کی تمام رنگینیاں پھیکی پڑ چکی تھیں۔ اگر خالد اسکی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دے سکتا۔ اگر وہ فقط ایک بار پوچھ لیتا کہ مایا تم کیسی ہو۔ اگر اس کے ہاتھ مایا کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو پونچھنے کے لیے معمولی سی آمادگی ظاہر کرتے تو بھائی کی جدائی کے احساس کے باوجود وہ اس بات پر خوش ہوتی کہ قدرت نے دیبل سے ان کے راستے جدا نہیں کیے۔ وہ جہاز پر سفر کے دوران میں اکثر یہ سوچا کرتی تھی کہ کاش خالد کے ساتھ اس کا سفر ختم نہ ہو۔ کاش کوئی طوفان جہاز کا رخ بدل دے

اور وہ خالد کے ساتھ کسی ایسے جزیرے میں پہنچ جاتے جہاں صاف اور شفاف پانی کی ندیاں بہتی ہوں۔ آبشاریں محبت کے گیت گاتی ہوں۔ سدابہار درخت لہلہاتے ہوں۔ گہری جھیل میں کنول کھلتے ہوں۔ دیبل کی بندرگاہ کی پہلی جھلک دیکھنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے اس کے سپنوں کی رنگین دنیا درہم برہم ہوئی لیکن قدرت نے جب انھیں جہاز کی بجائے ایک کشتی پر سوار کردیا تو مایا دیوی پھر سپنوں کی ایک نئی دنیا آباد کرنے لگی لیکن دیبل کے حادثہ نے ایک جیتے جاگتے نوجوان کو ایک پتھر کا مجسمہ بنا دیا تھا۔ محبت اور وفا کی دیوی کی ملتجی اور متمنی نگاہوں کے جواب میں خالد کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہ تھا۔

ان لوگوں میں صرف ناہید ایسی تھی جسے یہ یقین تھا کہ دیبل کے حادثے سے مایا دیوی کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایک عورت کی ذکاوتِ حس سے مایا کی ذہنی کشمکش کا اندازہ کرچکی تھی، اسے جب بھی موقع ملتا، وہ خالد کے سامنے مایا کی پاکیزگی، اس کی معصومیت اور اس کی حیا کا ذکر چھیڑ دیتی۔ خالد گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتا تو وہ کہتی "خالد! تمھارا دل بہت سخت ہے۔ تم دیکھتے نہیں اس کا سرخ و سفید چہرہ دوپہر کے پھول کی طرح مرجھا گیا ہے۔ اس کا بھائی برا سہی لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ معصوم ہے۔ وہ تمھیں اپنی آخری پناہ خیال کرتی ہے۔ تم اسے تسلی دے سکتے ہو۔ وہ اب یہاں تک کہہ چکی ہے کہ اگر اس کا بھائی واقعی اس سازش میں شریک تھا تو وہ اس کے پاس جانے سے مرنا بہتر سمجھتی ہے۔"

اور وہ جواب دیتا "میں دوپہر کے وقت چراغ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میں جو کچھ دیکھ چکا ہوں۔ اس کے بعد اس لڑکی کے متعلق اپنی رائے بدلنا میرے بس کی بات نہیں۔"

(۲)

چند دن اس قلعے میں رہنے کے بعد ناہید چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی لیکن تیر کا زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوا تھا۔ خالد کبھی کبھی سواروں کی کسی ٹولی کے ساتھ گشت کے لیے چلا جاتا۔

ایک شام مختلف اطراف سے سپاہیوں کی تمام ٹولیاں واپس آگئیں لیکن خالد اور اس کے چار ساتھی واپس نہ آئے۔ ناہید نماز مغرب کے بعد اپنے بھائی کی خیریت کے لیے دعا کررہی تھی۔ گنگو اپنے چند ساتھیوں کو خالد کی تلاش میں روانہ کرکے ایک اونچے درخت پر چڑھ کر اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ مایا قلعے سے باہر نکل کر گھنے درختوں میں سے اِدھر اُدھر جھانک رہی تھی۔ اچانک اسے دور سے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اس کا دل دھڑکنے لگا اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کا دامن ایک جھاڑی کے کانٹوں سے الجھ گیا۔ وہ کانٹوں کو الگ کررہی تھی کہ جھاڑیوں کے عقب سے خالد اور دوسرے سوار نمودار ہوئے۔ خالد نے گھوڑا روکتے ہوئے پوچھا "میری بہن کیسی ہے؟"

کانوں کے راستے یہ الفاظ مایا کے دل میں اتر گئے۔ وہ خالد کی طرف دیکھنے لگی۔ خاردار جھاڑی کی چند شاخیں جو اس نے بڑی مشکل سے اپنے دامن سے جدا کی تھیں۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پھر اس کے دامن میں الجھ گئیں۔

خالد نے پھر کہا "بتاؤ میری بہن ٹھیک ہے نا؟"

مایا نے چونک کر جواب دیا "وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ نے بہت دیر لگائی!"

"تم یہاں کیا کررہی ہو؟"

"میں ــــ کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر مایا پھر اپنے دامن کو کانٹوں سے چھڑانے لگی، لیکن اس کی نگاہیں خالد پر گڑی ہوئی تھیں۔ خالد گھوڑے سے اترا اور اس کے ساتھی

دزدیدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور مسکراتے ہوئے آگے نکل گئے خالد شاخوں کو ایک ایک کرکے اس کے دامن سے الگ کرنے لگا۔ مایا کا تنفس تیز ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو امڈنے لگے۔ اس نے اپنا کانپتا ہاتھ خالد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

خالد نے ایک شاخ اس کے دامن سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے پکڑو۔"

اس نے جلدی سے شاخ کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن ایک تیز کانٹا اس کی انگلی میں پیوست ہوگیا اور شاخ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پھر اس کے دامن میں الجھ گئی۔ مایا کانٹے کی تکلیف کے باوجود مسکرائی۔ تشکر کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ نے اس کا چہرہ شبنم آلود پھول سے کہیں زیادہ دلفریب بنا دیا۔ خالد نے اس کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا۔ "لاؤ میں نکال دوں۔"

مایا نے کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ خالد کانٹا نکال کر پھر جھاڑی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے پوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئیں؟"

مایا نے جواب دیا۔ "قلعے میں گرمی تھی اور میں ذرا ہوا خوری کے لیے نکل آئی تھی۔" لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا۔ "کیا سچ مچ تم میرے یہاں آنے کی وجہ نہیں سمجھ سکے؟ کاش میں تمام عمر کانٹوں میں الجھی رہوں اور تم نکالتے رہو۔"

خالد نے جواب دیا۔ "لیکن اس وقت درختوں کے نیچے تو زیادہ حبس ہے۔"

مایا نے پریشان سی ہوکر خالد کی طرف دیکھا۔ لیکن کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "میں دریا کی طرف جا رہی تھی۔"

"دریا دوسری طرف ہے۔"

"میں بھی اسی طرف جا رہی تھی لیکن —"

"لیکن کیا؟"

"گھوڑوں کی ٹاپ سن کر اس طرف لوٹ آئی۔ آج آپ نے بہت دیر کی میں ۔۔۔۔ بہت پریشان تھی۔"

"میں تمھاری پریشانی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ اگر میں زبیر اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح قید میں ہوتا تو تمھیں بہت اطمینان ہوتا لیکن میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اب بھی قید میں ہوں۔ میں تمھارے بھائی کی طرح اپنی بہن کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

مایا کے دل پر ایک چرکا لگا۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اس نے خلاف معمول خالد کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور اس کی چمکتی ہوئی پتلیوں پر پھر ایک بار پانی کے دھندلے نقاب چھا گئے۔ یہ نقاب ابھر کر چھلکتے ہوئے آنسوؤں میں تبدیل ہوگئے۔ پلکیں انھیں زیادہ سہارا نہ دے سکیں۔ دو چمکتے ہوتے موتی رخساروں پر ہلکی ہلکی لکیریں چھوڑتے ہوتے ہونٹوں پر آرکے۔ مایا نے اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا لیا۔

"چلو اب دیر ہو رہی ہے۔" خالد کی آواز سن کر مایا نے چونک کر چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس کا دامن کانٹوں سے الگ ہو چکا تھا اور خالد گھوڑے کی باگ پکڑ کر جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ بولی:۔

"آپ جائیے! میں خود آجاؤں گی لیکن میں آپ سے آخری بار صرف ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ میں بے قصور ہوں۔ اگر میرا بھائی اس سازش میں شریک تھا تو بھی یہ انصاف نہیں کہ اس کے پاپ کی سزا مجھے ملے۔"

خالد نے جواب دیا۔ "میں تمھیں سزا نہیں دینا چاہتا۔ تمھیں بہت جلد تمھارے بھائی کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ تمھارا بھائی بھی تم سے دور نہیں۔ وہ یہاں سے چار کوس دور دریا کے کنارے ایک ٹیلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ وہ راجہ سے انعام حاصل کرنے کے لیے قیدیوں کو برہمن آباد لے جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ دیبل کا حاکم

بھی ہے۔ کل تک وہ برہمن آباد پہنچ جائیں گے۔ شاید آج رات ہی تمھارے بھائی کے پاس ہمارا پیغام پہنچ جاتے اور اگر اس نے قیدیوں کو چھوڑنا منظور کر لیا، تو تمھیں اس کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ میں شروع سے اس بات کا حامی نہ تھا کہ تمھیں یہاں رکھا جائے۔ ہمارا اخلاق ہمیں یہ اجازت نہیں دیتا کہ ہم ایک بے بس عورت پر ہاتھ اٹھائیں تم اطمینان رکھو۔"

"آپ کو کس نے بتایا کہ میرا بھائی قیدیوں کو لے جا رہا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ پرتاپ کے ساتھ وہ بھی ایک قیدی کی حیثیت میں جا رہا ہو۔"

"میں آج خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ وہ ایک مشکی گھوڑے پر سوار تھا، اور قیدی بیل گاڑیوں پر بھی پابہ زنجیر تھے۔ چلو اب دیر ہو رہی ہے۔ گنگو میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"آپ جائیں! میں ابھی آتی ہوں۔"

(۳)

خالد گھوڑے کی باگ پکڑ کر پیدل چلتا ہوا قلعے کے دروازے تک پہنچا۔ گنگو باہر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "خالد! مایا کو کہاں چھوڑ آئے؟"

خالد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "وہ آ رہی ہے۔"

"رات ہو رہی ہے۔ تم اسے ساتھ کیوں نہ لے آئے؟"

"آپ لے آئیں، وہ کہتی تھی تم جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

گنگو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ عورت بھی عجیب مخلوق ہے۔ وہ چھپ چھپ کر تمھاری راہ دیکھ سکتی ہے۔ تمھارے لیے کانٹوں میں الجھ سکتی ہے لیکن تم ذرا اس

کی طرف مائل ہوئے اور وہ وحشی ہرنی کی طرح کترا کر بھاگی۔"

خالد نے جواب دیا۔ "میرے دل میں شاعری کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اب آپ بتائیں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ آپ دیبل کے قافلے کی خبر سن چکے ہوں گے۔"

"ہاں میں سن چکا ہوں۔ ان کے ساتھ دو سو مسلح سپاہی ہیں ہم مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ ان پر حملہ نہیں کر سکتے۔ میں جے رام کو یہاں لانے کی تجویز سوچ چکا ہوں۔"

"دیکھا اس لڑکی کی باتوں میں آ کر نا ہید جے رام کے متعلق اپنے خیالات بدل چکی تھی اور آپ بھی متاثر ہو رہے تھے۔"

گنگو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "بیٹا! تم مجھ سے زیادہ متاثر تھے۔ بہر حال مجھے اب یقین ہو چکا ہے کہ مایا معصوم ہے۔"

"اور اس کے باوجود آپ جے رام کو مایا کے قتل کی دھمکی دینا چاہتے ہیں۔"

"تمھارے ساتھیوں کو آزاد کرانے کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔"

"لیکن اگر جے رام نے اپنے راجہ کی خوشی پر اپنی بہن کو قربان کر دیا تو؟"

"مجھے ایسی امید نہیں لیکن اگر جے رام اس قدر ذلیل ثابت ہوا تو مایا جیسی لڑکی کو ایسے ظالم بھائی کے ہاتھوں سے بچانا ہمارا فرض ہے۔ وہ خود بھی جے رام کی بجائے تمھاری پناہ کو ترجیح دے گی۔ چند دنوں تک تمھاری بہن سفر کے قابل ہو جائے گی، اور ہم تمھیں مکران کی حدود کے اندر پہنچا دیں گے۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں کو مصیبت میں چھوڑ کر چلے جائیں۔"

"تم وہاں جا کر ان کی زیادہ مدد کر سکو گے۔ عربوں کے علاوہ سراندیپ کے ملاحوں کو بھی قید میں رکھے جانے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تمھارے جہازوں کے لوٹے جانے کی خبر سندھ سے باہر نہ نکلے۔ اگر یہ خبر وہاں تک پہنچ گئی تو تمھاری قوم اسے خاموشی سے برداشت نہیں کرے گی لیکن تم اس وقت تک نہیں جا سکتے۔ جب تک

کہ ناہید تندرست نہیں ہوتی۔ اگر جے رام ہمارے قابو میں آگیا تو یہ ممکن ہے کہ ہم کم از کم زبیر کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"اگر یہ ہو سکے، تو بہت اچھا ہوگا۔ میں عرب میں کسی کو نہیں جانتا ممکن ہے کہ بصرہ اور دمشق میں میری آواز پر کوئی توجہ نہ دے لیکن زبیر وہاں ہزاروں آدمیوں کو جانتا ہے۔ ہاں! آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آج رات میرے ذمہ کیا کام ہے؟"

گنگو نے جواب دیا۔ "تم آرام کرو، لیکن مایا دیوی ابھی تک نہیں آئی۔ شاید وہ دوسرے راستے قلعے میں پہنچ گئی ہو۔"

"میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر خالد بھاگتا ہوا قلعے میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے واپس آکر گنگو کو اطلاع دی کہ وہ اندر نہیں پہنچی۔"

گنگو نے کہا۔ "تم اسے کتنی دور چھوڑ آئے تھے؟"

"ان جھاڑیوں کے پیچھے کوئی سو قدم کے فاصلے پر۔"

"تم نے اس کے ساتھ کوئی سخت کلامی تو نہیں کی؟"

نہیں لیکن اسے میری ہر بات پر آنسو بہانے کی عادت ہو چکی ہے۔ ہاں میں ایک غلطی کر چکا ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کا بھائی یہاں سے چار کوس پر ہے۔"

"رات کے وقت اس جنگل کو عبور کرنا ایک عورت کا کام نہیں۔" یہ کہتے ہوئے گنگو نے اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر بلایا اور جنگل میں مایا کو تلاش کرنے کا حکم دے کر خالد سے کہا۔ "میرے خیال میں وہ ابھی تک اس خاردار جھاڑی سے باتیں کر رہی ہوگی۔ تم اس طرف جاؤ۔ میں دریا کی طرف جاتا ہوں۔ مجھے اس پر شک نہیں لیکن مایوسی کی حالت میں عورت توقع کے خلاف بھی بہت کچھ کر گزرتی

ہے۔ میں جاتا ہوں۔ کہیں دریا کے کنارے ہماری کشتی اس کی تباہی کا باعث نہ ہو۔"

(۴)

خالد کے جانے کے بعد مایا کچھ دیر اس خاردار جھاڑی کے قریب کھڑی رہی وہ کانٹے جو اس کے دامن کھینچ کر خالد کے ہاتھوں تک لے گئے تھے۔ اس کے لیے مہکتے پھولوں سے کم نہ تھے۔ وہ ان چند لمحات کا تصور کر رہی تھی، جب خالد اس سے اس قدر قریب تھا۔ اس کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ یکے بعد دیگرے زہر اور شہد کے گھونٹ اپنے حلق سے اتار رہی تھی۔ اس کا دل خالد کے متعلق متضاد خیالات کی رزم گاہ تھا۔ وہ کبھی اسے قہر و غضب کا پیکر مجسم اور کبھی ایثار و محبت کا دیوتا خیال کرتی۔ تھوڑی دیر وہاں کھڑی رہنے کے بعد وہ اپنے دل پر ایک ناقابل برداشت بوجھ محسوس کرنے لگی اور چاند کی روشنی میں درختوں اور جھاڑیوں سے بچتی ہوئی دریا کی طرف چل دی۔

دریا کے کنارے ایک کشتی کھڑی تھی۔ وہ کشتی جس نے انھیں سمندر سے یہاں تک پہنچایا تھا۔ جس پر سفر کرتے ہوئے اس نے پہروں آسمان کے ستاروں سے باتیں کی تھیں اس نے کشتی کے ایک سرے پر بیٹھ کر نیچے پاؤں لٹکا دیے۔ پانی کی لہریں اس کے پاؤں کو چھو رہی تھیں۔ آس پاس جنگل میں گیدڑوں اور بھیڑیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ مایا نے اپنے دل سے سوال کیا۔ "اگر کوئی بھیڑیا اس طرف آجائے تو؟" اور پھر خود ہی جواب دیا۔ "اگر بھیڑیا آجائے تو میں بھاگنے کی کوشش نہ کروں گی۔ میں کشتی سے اتر کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاؤں گی اور پھر جب وہ صبح کے وقت میری لاش دیکھے گا تو اس کی کیا حالت ہوگی؟ وہ کہے گا، مایا! تم ادھر کیوں آئیں۔ میں تو تمھارے

ساتھ مذاق کرتا تھا میں جانتا تھا، تم بے قصور ہو۔ مایا مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمھیں پہچاننے میں غلطی کی۔ نہیں نہیں!! وہ شاید یہ نہ کہے۔ وہ کہے گا۔ یہ دیوانی تھی یہ پگلی تھی۔ ہاں میں سچ مچ پگلی ہوں۔ اس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ وہ میرا دامن کانٹوں سے چھڑا رہا تھا اور میں سمجھ رہی تھی کہ مجھے دنیا کی بادشاہت مل گئی ـــــ میں دریا کے کنارے ریت کے گھروندے بنا رہی تھی اس کا دل پتھر کا ہے۔ وہ ظالم ہے۔ اسے کسی پر اعتبار نہیں، اور ہو بھی کیونکر، میرے بھائی نے ان لوگوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ کاش! وہ میرا بھائی نہ ہوتا۔ کاش اس نے جہاز ہی پر مجھے بتا دیا ہوتا کہ وہ ان کے ساتھ یہ دھوکا کرنے والا ہے اور وہ چھپ چھپ کر خالد کو نہ دیکھتی۔ اب وہ مجھے بھائی کے پاس بھیجنے والے ہیں لیکن اگر اس کا انجام یہی تھا تو قدرت نے مجھے اس کے جہاز پر کیوں پہنچایا؟ اور پھر جب ہم دیبل سے جدا ہونے والے تھے، قدرت ہمیں یہاں کیوں لے آئی؟ میں اب تک اس کی نفرت کے باوجود اسے محبت کی نگاہوں سے کیوں دیکھتی رہی۔ میں نے مایوسی کی آندھیوں میں کھڑی ہو کر امید کے چراغ کیوں جلائے ـــــ ہاں میں مجبور تھی ...... یہ میرے بس کی بات نہ تھی...... میں اب بھی بے بس ہوں... .... میرا کوئی نہیں.... میرا کوئی نہیں.... میں اپنے بھگوان کو پکار چکی ہوں، جس کی وہ دن میں پانچ بار عبادت کرتا ہے لیکن میرے لیے آنسوؤں اور آہوں کے سوا کچھ نہیں ـــــ آنسو اور آہیں ـــــ کاش! میں پیدا ہی نہ ہوتی۔ کاش! سمندر کی لہریں مجھ پر ترس نہ کھاتیں۔"

مایا سر کو ہاتھوں کو سہارا دے کر دیر تک ہچکیاں لیتی رہی۔ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے "مایا" کہہ کر پکارا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ گنگو اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "بیٹی! تم ڈر گئیں، اس

وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"تم رو رہی ہو۔ کیا ہوا؟"

مایا خاموش رہی۔ گنگو نے پھر پوچھا۔ "اس وقت ایسی سنسان جگہ پر تمھیں ڈر نہیں لگتا؟ سنو، چاروں طرف سے بھیڑیوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ چلو میرے ساتھ!"

مایا نے کہا۔ "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"آپ سچ مچ مجھے میرے بھائی کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟"

گنگو نے جواب دیا۔ "میں اپنا فیصلہ بتانے سے پہلے تمھارا فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔"

"بھگوان کے لیے مجھے اس کے پاس نہ بھیجیے!"

"لیکن کیوں؟"

"میں بھائی کے پاس نہیں جانا چاہتی۔ جس نے میری ماں کے دودھ کی لاج نہیں رکھی۔"

"یہ تم دل سے کہہ رہی ہو یا مجھے بنانے کے لیے؟"

"کاش آپ میرا دل چیر کر دیکھ سکتے۔"

"لیکن جے رام سے نفرت کی وجہ؟"

"میں خالد سے اس کے متعلق سن چکی ہوں اور اب مجھے اس کی دغابازی کے متعلق کوئی شبہ نہیں رہا۔"

"لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم تمھیں تمھارے بھائی کے حوالے کر کے زبیر کے ساتھیوں

کو آزاد کروا سکیں۔"

"اگرچہ رام ایک دفعہ دھوکا کر چکا ہے تو وہ دوبارہ موقع ملنے پر بھی ایسا ہی کرے گا۔ اسے کسی صورت بھی یہ معلوم نہیں ہونا چاہیئے کہ میں آپ کے پاس ہوں۔ ورنہ وہ راجہ کے سپاہیوں کو ساتھ لے کر جنگل کا کونہ کونہ چھان مارے گا۔ ناہید اچھی طرح چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوئی۔ آپ کے لیے اس کی حفاظت بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"بیٹی! تم اطمینان رکھو۔ جے رام کو تمھیں میرے قبضہ میں دیکھ کر سب مکاریاں بھول جائیں گی۔ اگر بعد میں اس کی طرف سے کوئی خدشہ بھی پیش آیا۔ تو ناہید کے لیے میں ایک اور محفوظ جگہ تلاش کر چکا ہوں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس نے قیدی آپ کے حوالے کر دیے تو آپ مجھے اس کے سپرد کر دیں گے؟"

"بیٹی! وہ تمھارا بھائی ہے تم اس کے پاس جانے سے کیوں ڈرتی ہو؟"

"میرا دنیا میں کوئی نہیں، بھائی نے مجھے اپنے مقصد پر قربان کرنا چاہا اور میں آپ کے قبضے میں آ گئی۔ اب آپ مجھے بیٹی کہہ کر اپنے مقصد کے لیے پھر اس کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں، اپنے بھائی کی طرح آپ کا فیصلہ بھی میرے لیے تقدیر کا حکم ہو گا۔ کاش! میری تقدیر میرے ہاتھ میں ہوتی۔ کاش! مجھے اس دنیا میں اپنا راستہ تلاش کرنے کا حق ہوتا لیکن میری پسند اور ناپسند کے کوئی معنی نہیں میں اس طوفان میں ایک تنکا ہوں جسے ہوا کا جھونکا جس طرف چاہے اڑا کے لے جا سکتا ہے۔ میرا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔"

گنگو نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "اگر یہ معاملہ تمھاری پسند پر چھوڑ دیا جائے تو تم کیا کرو گی؟"

مایا نے قدرے پُراُمید ہو کر جواب دیا۔ "میں آپ کی قید کو آزادی پر ترجیح دوں گی۔"

"وہ کیوں؟"

"میں ناہید کو بیماری کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔"

"مایا! میں ایک سوال پوچھتا ہوں، سچ کہو، تمھیں خالد کے ساتھ محبت ہے؟"

مایا نے آنکھیں جھکا لیں۔

اس نے پھر کہا۔ "مایا! میرے سوال کا جواب دو۔"

وہ بولی۔ "لیکن آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟"

"اس لیے کہ شاید اس سوال کا جواب پوچھ کر میں تمھارے لیے کوئی بہتر فیصلہ کر سکوں۔"

"مجھے معلوم نہیں، لیکن میں صرف یہ جانتی ہوں کہ میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"تم یہ بھی جانتی ہو کہ تمھارے متعلق اس کے شکوک ابھی تک رفع نہیں ہوئے اس کا دل سمندر کی چٹانوں سے زیادہ سخت ہے۔ میں تمھیں بیٹی کہہ چکا ہوں۔ آج سے تمھارا سکھ میرا سکھ اور تمھارا دکھ میرا دکھ ہو گا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم کسی دن اسے اپنا بنا لینے کی امید پر سب کچھ قربان کر دو۔ ممکن ہے اسے تمام عمر تمھاری نیک نیتی کا یقین نہ آئے۔ اپنے متعلق اس کے خیالات بدلنے کے لیے تمھیں بہت بڑی قربانی دینی پڑے گی۔"

"میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں لیکن مجھ سے ہمیشہ کی جدائی برداشت نہیں ہو سکتی۔"

"تمھیں بھائی کا خیال تو نہیں ستائے گا؟"

"راجہ کے ٹکڑے کھانے کے بعد وہ میرا بھائی نہیں رہا۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں۔"

گنگو نے کہا "میں اسے ایک طریقے سے یہاں لانا چاہتا ہوں۔ اس کی صورت دیکھ کر تمہارا دل پسیج تو نہ جائے گا ــــــ؟ اس نے اپنے محسنوں سے دغا کی ہے۔ اگر اس کی سزا تم پر چھوڑ دی جائے، تو تم اس کے ساتھ کیا سلوک کرو گی؟"

"وہی جو ایک دغا باز، فریبی اور بزدل کے ساتھ ہونا چاہیئے۔"

گنگو نے کہا۔ "مایا! مجھے سوچ کر جواب دو۔ یہ ایک کڑا امتحان ہے۔ ممکن ہے کہ میں تمہارے بھائی کو تمہارے سامنے کھڑا کر کے تمہارے ہاتھ میں انصاف کی تلوار دے دوں۔"

"میں سوچ چکی ہوں۔ میں اسے رحم کا مستحق نہیں سمجھتی۔"

گنگو کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جھاڑیوں کے پیچھے سے خالد کی آواز آئی "مایا! مایا! تم کہاں ہو؟"

گنگو نے مایا سے کہا۔ "تم کشتی میں چھپ جاؤ اور جب تک میں نہ بلاؤں، باہر نہ آنا۔"

مایا نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی۔ گنگو کشتی سے اتر کر دریا کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ خالد نے پھر آواز دی، اور اس نے کہا۔ "خالد میں ادھر ہوں۔"

(۵)

خالد نے جھاڑیوں کے عقب سے نمودار ہو کر پوچھا۔ "مایا نہیں ملی؟ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

گنگو نے اپنے لہجے کو مغموم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مایا چلی گئی۔

آہ بے چاری!"

خالد نے بدحواس ہو کر پوچھا۔ "کہاں چلی گئی۔ کیا ہوا؟"

"خالد تم نے بہت بُرا کیا۔ کاش تم اس کا دل نہ توڑتے۔"

"آخر کیا ہوا؟ خدا کے لیے مجھے بتاؤ۔"

"اب پچھتانے سے فائدہ؟ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ کاش وہ تم جیسے سنگدل انسان سے محبت نہ کرتی!"

خالد نے بے تاب ہو کر گنگو کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لیے مجھے پریشان نہ کرو۔ صاف صاف کہو کیا ہوا؟"

"مایا چل بسی۔ میں یہاں پہنچا، تو وہ دریا کے کنارے کھڑی تھی۔ میں نے اسے آواز دی اور اس نے مجھے جواب دینے کی بجائے دریا میں چھلانگ لگا دی میں نے جلدی جلدی کپڑے اتارے لیکن اتنی دیر میں اسے پانی کی لہر کنارے سے بہت دور لے گئی۔ جب میں پانی میں کودنے لگا وہ لہروں کی آغوش میں چھپ چکی تھی۔"

خالد نے چلا کر کہا۔ "مایا ڈوب رہی تھی اور تم اطمینان سے کنارے کھڑے کپڑے اتار رہے تھے، بے رحم! ظالم!! ڈاکو!!! میں سمجھتا تھا کہ تم انسان بن چکے ہو۔"

گنگو نے کہا۔ "میں کپڑوں سمیت چھلانگ لگا دیتا تو خود ڈوب جاتا۔"

"تو تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ڈوبنے سے دنیا میں کوئی کمی آجاتی؟"

"تو اس کے مرنے سے دنیا میں کون سی کمی آگئی ہے۔ بھائی سے اس کا دل ٹوٹ چکا تھا تمہارے طرز عمل سے وہ مایوس ہو چکی تھی۔ اچھا ہوا۔ وہ گھل گھل کر مرنے کی بجائے دریا میں ڈوب کر مر گئی۔ ہاں جب میں کپڑے اتار رہا تھا اور لہریں اسے دھکیل کر منجدھار کی طرف لے جا رہی تھیں۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔ گنگو! مجھے بچانے کی کوشش بے سود ہے۔ خالد کو میرا سلام کہنا۔ میں اس کی محبت سے مایوس ہو کر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔"

خالد دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ گنگو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "خالد چلو! اب افسوس سے کیا حاصل؟ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔"

خالد نے اس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "تم جاؤ!"

گنگو نے کہا۔ "آج رات ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں چلو!"

خالد نے سخت لہجے میں کہا۔ "گنگو خدا کے لیے جاؤ! مجھے تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔"

وہ بولا۔ "خالد! مجھے معلوم نہ تھا کہ مایا کی موت کا تمھیں اس قدر صدمہ ہوگا۔ ورنہ میں اپنی جان پر کھیل کر بھی اسے بچانے کی کوشش کرتا۔"

خالد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس کی موت کا صدمہ! گنگو تمھارے پہلو میں ایک انسان کا دل نہیں۔ یہ حادثہ میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ اس کی موت کا باعث میں ہوں اور میں مرتے دم تک اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گا۔"

"لیکن تم تو مجھ سے کئی بار یہ کہہ چکے تھے کہ مایا دیوی کو اسکے بھائی کے پاس بھیجدو۔ اگر تمھیں اس سے جدا ہونے کا افسوس نہ تھا تو اس کی موت کا اس قدر رنج کیوں ہے؟"

"گنگو خدا کے لیے میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو۔ میں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی اور یہ سزا میری قوت برداشت سے زیادہ ہے۔"

"خالد چھوڑو ان باتوں کو، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ ایک بار پھر زندہ ہو جائے تو بھی تمھارا غرور تمھیں اس کی محبت کا جواب دینے کی اجازت نہیں دے گا۔ تم اس کے ساتھ اسی طرح پیش آؤ گے۔ چلو ایک دو دن میں تم اسے بھول جاؤ گے۔"

خالد کوئی جواب دینے بغیر ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا، اور دریا کی لہروں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے درد بھری آواز میں کہا —— "مایا! مایا! یہ تم نے کیا کیا!"

گنگو نے پھر کہا۔ "خالد! تمھیں اب ایک مرد کے حوصلے سے کام لینا چاہیئے۔"

"گنگو! تم جاؤ، میں ابھی آجاؤں گا۔"

"اچھا تمھاری مرضی۔" گنگو یہ کہہ کر چل دیا لیکن قلعے کا رخ کرنے کی بجائے جھاڑیوں میں چھپتا ہوا کشتی کے قریب ایک درخت کی آڑ میں جا کھڑا ہوا۔ اس نے آہستہ سے آواز دی۔ "مایا! اب نکل آؤ۔"

مایا کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ خالد اور گنگو کی باتیں سن چکی تھی۔ وہ اس موت کو جو اسے خالد کے دل سے اس قدر قریب لا سکتی تھی ہزار زندگیوں پر ترجیح دینے کے لیے تیار تھی۔ وہ خالد کی آہیں سن رہی تھی اور اسے خدشہ تھا کہ اس مذاق کے بعد خالد اس سے ہمیشہ کے لیے بدظن ہو جائے گا۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔ کاش! میں سچ مچ دریا میں کود گئی ہوتی، اور آن کی آن میں یہ خیال ایک خوفناک ارادے میں تبدیل ہو گیا۔

گنگو نے پھر آہستہ سے آواز دی۔ مایا کے لیے سوچنے اور فیصلہ کرنے کا موقع نہ تھا۔ اس نے اچانک اٹھ کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔

گنگو "مایا! مایا!" کہتا ہوا بھاگا۔ خالد بدحواس ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور دونوں بیک وقت دریا میں کود پڑے۔ گنگو کہہ رہا تھا۔ "خالد! پکڑو یہ مایا ہے مایا ٹھہرو! آگے پانی بہت خطرناک ہے۔" لیکن وہ تیر کر تیز دھارے میں جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

خالد تیزی سے پانی کو چیرتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ مایا نے غوطہ لگا دیا لیکن اچھی خاصی تیراک کے لیے اپنے آپ کو پانی کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ممکن نہ تھا۔ اس نے جلد ہی اپنا سر پانی سے باہر نکال لیا۔ اور پھر منجدھار کی طرف جانے کی کوشش کرنے لگی، لیکن خالد نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اتنی دیر میں گنگو بھی پہنچ گیا اور دونوں مایا کو سہارا دے کر کنارے کی طرف تیرنے لگے۔

کنارے پر پہنچ کر گنگو نے کہا۔ "خالد! اب مجھے اس لڑکی پر کوئی اعتبار نہیں رہا۔"

اسے تمھاری بے رخی نے پاگل بنا دیا ہے۔" اور پھر مایا سے مخاطب ہو کر پوچھا "مایا! تم نے دریا میں چھلانگ کیوں لگائی؟"

اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "آپ نے ان کے ساتھ یہ مذاق کیوں کیا تھا؟"

گنگو نے خالد سے کہا۔ "بھئی! مجھے معاف کرنا۔ میں نے تمھیں چھیڑنے کے لیے مایا کو کشتی میں چھپا دیا تھا لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ سچ مچ ایسا کر دکھائے گی۔ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور میں خوش ہوں۔"

خالد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں صرف آنسو تھے۔ محبت خوشی اور تشکر کے آنسو!

گنگو نے پوچھا۔ "اب مایا کے متعلق تمھارا کیا فیصلہ ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "مایا کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کا کسی کو حق نہیں وہ اپنے متعلق خود فیصلہ کر سکتی ہے۔"

بہن اور بھائی

علی الصباح قلعہ سے چار کوس کے فاصلے پر دریا کے کنارے پرتاپ رائے کے سپاہی سفر کی تیاری کر رہے تھے۔ جے رام دریا میں نہا کر کپڑے بدل رہا تھا کہ پاس ہی ایک جھاڑی کے عقب سے ایک سنسناتا ہوا تیر آیا، اور اس کے پاؤں کے نزدیک زمین میں پیوست ہو گیا۔ تیر کے ساتھ ایک سفید رومال بندھا ہوا تھا۔ جے رام نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد زمین سے تیر نکالا اور اس کے ساتھ بندھا ہوا رومال کھول کر دیکھنے لگا۔ جس پر کوئلے کے ساتھ یہ چند حروف لکھے ہوئے تھے:

"جے رام! میں تمھیں کس نام سے پکاروں۔ تم کو بھائی کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ اگر میری جان بچانا چاہتے ہو، تو گنگو کے ساتھ چلے آؤ، ورنہ میری خیر نہیں۔"

تمھاری بدنصیب بہن

مایا

جے رام نے بھاگتے ہوئے جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر آواز دی۔ "گنگو! گنگو! تم کہاں ہو؟"

گنگو نے آہستہ سے جواب دیا۔ "میں یہاں ہوں اس طرف"

جے رام جھاڑیوں میں سے گزر کر اس کے قریب پہنچا۔ گنگو گھوڑے پر سوار تھا۔ جے رام نے گھوڑے کی لگام پکڑلی اور بیقرار سا ہو کر پوچھا "گنگو! مایا کہاں ہے؟ وہ کس حال میں ہے۔ وہ تمھارے پاس کیسے پہنچی؟"

گنگو نے جواب دیا۔ "مایا زندہ ہے اور میں تمھیں اس کے پاس لے جا سکتا ہوں کہو تم میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو؟"

"میں؟ مایا کے لیے سات سمندر عبور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بھگوان کے لیے بتاؤ وہ کہاں ہے؟"

"وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ تم میرے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔"

"اگر زیادہ دور ہو تو میں اپنا گھوڑا لے آؤں۔"

"تم اپنا گھوڑا لا سکتے ہو لیکن اگر تم نے پھر کوئی چالاکی کی تو یاد رکھو۔ مایا کو کبھی نہیں دیکھ سکوگے۔ میں یہاں تمھارا انتظار کرتا ہوں۔"

"میں ابھی آتا ہوں۔" جے رام یہ کہہ کر ٹیلے کی طرف بھاگا۔ گنگو احتیاط کے طور پر اس جگہ سے ہٹ کر گھنے درختوں کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جے رام نے جھاڑی کے قریب پہنچ کر گھوڑا روکا اور گنگو کو وہاں نہ پا کر آواز دی۔ گنگو نے مطمئن ہو کر اسے اپنے پاس بلا لیا۔

گنگو کے ساتھ چلنے سے پہلے جے رام نے اس سے کئی سوالات پوچھے، لیکن گنگو نے صرف یہ جواب دیا کہ مایا کے پاس پہنچ کر تمھیں سب حال معلوم ہو جائے گا۔ جنگل میں تھوڑی دور چلنے کے بعد گنگو کے دس اور مسلح ساتھی جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جے رام کو گنگو کی نیت پر شبہ ہوا اور اس نے لگام کھینچ کر گھوڑے کو روکتے ہوئے پوچھا "گنگو! یہ کیا؟" لیکن اس سے پہلے کہ گنگو کوئی جواب دیتا اس کے

ساتھیوں نے جے رام کو چاروں طرف گھیر لیا اور ایک نے آگے بڑھ کر اس کے گھوڑے کی لگام چھین لی۔ گنگو کی توقع کے خلاف جے رام نے کوئی مدافعت نہ کی اور جب اس کے ساتھیوں نے اس کے ہتھیار چھیننے کی کوشش کی تو اس نے خود ہی اپنی تلوار کمان اور ترکش اتار کر ان کے حوالے کر دیے۔

کمر کے پٹکے میں ایک چھوٹا سا خنجر لٹک رہا تھا۔ گنگو کے ایک ساتھی نے وہ بھی اتارنا چاہا لیکن اس نے اشارے سے منع کیا۔

جے رام نے کہا۔ "تمھیں معلوم ہے کہ میں مایا کا پیغام سننے کے بعد بھاگ نہیں سکتا۔"

گنگو نے جواب دیا۔ "تم بھاگنے کی کوشش بھی کرو تو کامیاب نہیں ہو سکتے اس جنگل میں جگہ جگہ تیر انداز چھپے ہوئے ہیں۔"

"لیکن گنگو میں نے تم سے کوئی وعدہ خلافی نہیں کی۔ تم جہاں کہو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

"جو شخص زبیر جیسے محسن کے ساتھ دغا کر سکتا ہے۔ مجھے اس کی کسی بات پر اعتبار نہیں آ سکتا۔ تمھاری خیر اسی میں ہے کہ آنکھیں بند کر کے میرے ساتھ چلتے رہو۔"

قلعہ چار کوس سے زیادہ دور نہ تھا لیکن گنگو نے مصلحتاً طویل اور دشوار گذار راستہ اختیار کیا۔ قلعے کے سامنے پہنچ کر سوار گھوڑوں سے اترے۔ جے رام کو خالد قلعے سے باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا۔ "خالد! خالد!! تم بھی یہاں ہو۔ تم بھی یہاں ہو۔ تمھاری بہن کہاں ہے؟"

خالد نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور جواب دینے کی بجائے کترا کر گنگو کے پاس آ کھڑا ہوا۔ جے رام کے دل پر چرکا لگا۔ اس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ وہ ہاتھ جو خالد کے استقبال کے لیے اٹھے تھے، جھکتے جھکتے پہلوؤں سے آ لگے۔ اس

نے بے چارگی اور بے بسی کی حالت میں چاروں طرف دیکھا اس کی نگاہیں پھر ایک بار خالد کے چہرے پر جم گئیں۔ خالد نے منہ پھیر لیا۔

جے رام نے انتہائی کرب کی حالت میں کہا۔ "خالد! مجھے معلوم نہیں۔ میں تم سب کی نظروں میں اس قدر حقیر کیوں ہو گیا ہوں۔ میں بے قصور ہوں۔ میرے ساتھ اس طرح پیش نہ آؤ۔ مایا کہاں ہے؟"

(۲)

پیچھے سے آواز آئی۔ "میں یہاں ہوں"۔ جے رام نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ مایا چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ "مایا! مایا!! میری بہن! میری ننھی بہن!!" وہ یہ کہہ کر مایا کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے ہٹتے ہوئے چلائی۔ "ظالم! کمینے، دغاباز! مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ تم نے ایک راجپوت باپ کے خون اور ایک راجپوت ماں کے دودھ کی لاج نہیں رکھی تم میرے کچھ نہیں لگتے۔ تمھارا دامن اپنے محسنوں کے خون سے داغدار ہے۔"

اگر کوئی جے رام کا سینہ خنجر سے چھلنی کر ڈالتا، تو بھی شاید اسے اس قدر تکلیف نہ ہوتی اس کے دل میں غصے کی آگ کے شعلے بھڑکے اور غم کے آنسوؤں سے بجھ گئے اس نے پھر ایک بار چاروں طرف دیکھا۔ گنگو کے چہرے پر ایک حقارت آمیز تبسم دیکھ کر اس کا منجمد خون کھولنے لگا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتا اور ہونٹ چباتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ "ذلیل ڈاکو! ان سب باتوں کے ذمہ دار تم ہو۔ تم نے ان سب کو میرے خلاف کیا ہے۔" پیشتر اس کے کہ گنگو کے ہاتھ مدافعت کے لیے اٹھتے، جے رام نے اچانک دو مکّے اس کے منہ پر دے مارے۔ گنگو اپنے گال سہلاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ خالد نے آگے بڑھتے ہوئے ایک مکا جے رام کے منہ پر مارا۔ جے رام نے

خالد کے ہاتھ کی ضرب منہ سے زیادہ دل پر محسوس کی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"خالد! تم ـــــ؟"

گنگو کے ساتھیوں کی تلواریں نیاموں سے باہر آچکی تھیں۔ لیکن اس نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور جے رام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب بتاؤ! تم اپنی بہن کی جان بچانے کے لیے زبیر کے ساتھیوں کو قید سے چھڑانے کے لیے تیار ہو؟"

جے رام نے زخم خوردہ سا ہو کر جواب دیا۔ "تو کیا تم بھی زبیر کی طرح یہ سمجھتے ہو کہ میں پرتاپ رائے کی سازش میں شریک تھا؟"

گنگو نے جواب دیا۔ "نہیں بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پرتاپ رائے تمھاری سازش میں شریک تھا۔ تم نے اسے سراندیپ کے ہاتھیوں اور جواہرات کا لالچ دے کر جہاز لوٹنے کے لیے آمادہ کیا۔"

"بھگوان جانتا ہے کہ میں بے قصور ہوں۔"

گنگو نے جواب دیا۔ "بھگوان اس سے زیادہ جانتا ہے۔ اس وقت ہمارا کام تمھاری بے گناہی پر بحث کرنا نہیں۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم اپنی بہن کے لیے ان بے گناہ قیدیوں کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟"

جے رام نے جواب دیا۔ "کاش! انھیں چھوڑنا میرے بس میں ہوتا۔ وہ اس وقت دو سو سپاہیوں کے پہرے میں برہمن آباد جا رہے ہیں اور میں اکیلا ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"تو تم ہمیں یہ بتانا چاہتے ہو کہ تمھارے اپنے سپاہی تمھارا کہا نہیں مانتے؟"

"کاش! وہ میرے سپاہی ہوتے۔ قیدیوں پر پرتاپ رائے کا پہرہ اس قدر سنگین

ہے کہ میں ان کے ساتھ بات چیت بھی نہیں کر سکتا۔ اسے یقین ہو چکا ہے کہ میں ان کا طرفدار ہوں۔"

گنگو نے اپنے چہرے پر ایک طنز بھری مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "تمھاری طرفداری کا شکریہ! اب میرے سوال کا جواب دو۔ تم انھیں چھڑانے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟"

بھگوان کے لیے مجھ پر اعتبار کرو۔ جب تک ان کا معاملہ راجہ کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا۔ میں بے بس ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ راجہ انھیں قید میں رکھ کر عربوں سے لڑائی مول لینے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

گنگو نے کہا۔ "پرتاپ رائے تمھارا دوست ہے اگر اس کے پاس تمھارا خط پہنچ جائے کہ تم ہماری قید میں ہو تو کیا پھر بھی وہ انھیں رہا نہیں کرے گا۔ تم یہ خط لکھ دو اور ہم تمھارے برہمن آباد پہنچنے سے پہلے تمھارا یہ خط پہنچا دیں گے۔"

جے رام نے جواب دیا۔ "وہ لومڑی سے زیادہ مکار اور بھیڑیئے سے زیادہ ظالم ہے۔ مجھے اپنی سرگذشت بیان کرنے کا موقع دو۔ تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ بھگوان کے لیے میری بات مانو۔ پرتاپ رائے کو میری جان بچانے سے زیادہ خالد اور اگر ناہید بھی یہاں ہے تو ان دونوں کی تلاش ہوگی۔ جس طرح مجھے اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ تم یہاں کیسے پہنچے، اسی طرح تم میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ دیبل کا واقعہ کس طرح پیش آیا۔"

گنگو اور اس کے ساتھیوں کو متوجہ دیکھ کر جے رام نے بندرگاہ سے رخصت ہونے سے لے کر قید خانے میں زبیر سے ملاقات تک کے تمام واقعات بیان کیے اور اختتام پر گنگو اور خالد کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب بھی تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں آتا، تو میں ہر سزا خوشی سے برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

گنگو بولا۔ "تو اب تم راجہ کے پاس قیدیوں کی سفارش کے لیے جا رہے ہو؟"

"آپ کو اب بھی یقین نہیں آیا؟"

"اپنی بہن سے پوچھ لو۔ اگر اسے تمھاری باتوں پر اعتبار آگیا ہو تو ہم بھی تم پر اعتبار کرنے کے لیے تیار ہیں۔" یہ کہہ کر گنگو مایا سے مخاطب ہوا۔ "ہم تمھارے بھائی کا فیصلہ تم پر چھوڑتے ہیں۔"

جے رام، مایا کی طرف متوجہ ہوا۔ مایا کے لیے یہ گھڑی صبر آزما تھی۔ بھائی کی سرگذشت سننے کے بعد اس کے دل میں ایک ردّعمل شروع ہو چکا تھا تاہم وہ اس کے متعلق اپنے خیالات فوراً بدلنے کے لیے تیار نہ تھی۔ ضمیر کی ایک آواز اگر یہ کہہ رہی تھی کہ مایا تجھے اپنے بھائی پر اعتبار کرنا چاہیئے۔ تو دوسری آواز کہہ رہی تھی کہ نہیں، وہ صرف تمھیں ساتھ لے جانے کے لیے بہانے بنا رہا ہے۔ اس ذہنی کشمکش کے دوران میں اسے گنگو کے یہ الفاظ یاد آئے۔ "اس کی صورت دیکھ کر تمھارا دل تو پسیج نہ جائے گا ممکن ہے کہ میں تمھارے ہاتھ میں انصاف کی تلوار دے دوں۔" مایا نے گنگو کی طرف دیکھا اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ "میں انصاف کی تلوار تمھارے ہاتھ میں دے چکا ہوں۔ اب تم اپنا وعدہ یاد کرو۔"

جے رام نے مایا کے تذبذب سے پریشان ہو کر کہا۔ "مایا! تمھیں بھی اب مجھ پر اعتبار نہیں آتا؟"

اس نے جواب دیا۔ "اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم نے ان لوگوں کے انتقام کے خوف سے یہ قصہ نہیں سنایا؟"

جے رام نے درد بھری آواز میں کہا۔ "مایا! تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں بزدل ہوں میں موت کے خوف سے جھوٹ بول رہا ہوں۔ بھگوان کے لیے مجھے دوسروں کے سامنے شرمسار نہ کرو۔ میں تمھارا بھائی ہوں۔ لیکن اگر تمھیں مجھ پر یقین نہیں آتا تو یہ میرا خنجر

لو اور میرا دل چیر کر دیکھو کہ میرا لہو ابھی تک سرخ ہے یا سفید ہو چکا ہے۔" یہ کہتے ہوئے جے رام نے اپنا خنجر مایا کے ہاتھ میں دے دیا اور اپنا سینہ اس کے سامنے تان کر بولا "مایا! تمھیں باپ کے سفید بالوں کی قسم اپنی ماں کے دودھ کی قسم! اگر میں مجرم ہوں، تو یہ خیال نہ کرو کہ میں تمھارا بھائی ہوں۔ میں یہ جاننے کے بعد زندہ نہیں رہنا چاہتا کہ میری بہن بھی مجھے بزدل خیال کرتی ہے۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند سلا دو۔ تمھاری رگوں میں اگر ایک راجپوت کا خون ہے تو اپنے بھائی کے ساتھ رعایت نہ کرو۔"

مایا نے جذبات کی شدت میں غیر شعوری طور پر اپنا ہاتھ جس میں خنجر تھا، بلند کیا۔ جے رام کے ہونٹوں پر ایک دلفریب مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ خالد نے کپکپی لی۔ مایا نے عزم و ہمت کے اس پیکر کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ اس کا ہاتھ کانپنے لگا۔ خالد چلایا۔ "مایا! تمھارا بھائی معصوم ہے۔" مایا کے کانپتے ہوئے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور وہ بے اختیار جے رام سے لپٹ کر ہچکیاں لینے لگی۔ "بھیا! بھیا!! مجھے معاف کر دو۔"

جے رام اس کے سیاہ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بار بار یہ کہہ رہا تھا۔ "میری بہن! میری ننھی مایا!"

بہن اور بھائی ایک دوسرے سے علٰحدہ کھڑے ہو گئے۔ خالد نے جے رام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جے رام! مجھے معاف کرنا۔ مجھے تم پر شک نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

جے رام نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو میں بھی شاید یہی کرتا۔"

خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے ہنگامی جوش میں آپ کے منہ پر مکا

رسید کر دیا تھا۔ اب آپ یہ قرض وصول کر سکتے ہیں۔"

جے رام نے کہا۔ "نہیں! اب یہ قصہ نہ چھیڑو، ورنہ تمھیں ایک مکا مار کر مجھے گنگو سے دو وصول کرنے پڑیں گے۔"

(۳)

گنگو اپنی زندگی میں کبھی اس قدر پریشان نہیں ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا جے رام نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "گنگو! اگر تم خلوص دل سے زبیر اور اس کے ساتھیوں کو چھڑانا چاہتے ہو، تو یہ معاملہ چند دن کے لیے مجھ پر چھوڑ دو۔ مجھے امید ہے کہ راجہ صحیح خطرات سے باخبر ہو کر انھیں قید میں رکھنے کی جرأت نہیں کرے گا، اور اگر اس نے میری بات نہ سنی، تو میں تمھارے پاس چلا آؤں گا، اور پھر ہم کوئی اور تدبیر سوچیں گے لیکن خالد کی بہن کہاں ہے؟"

گنگو نے جواب دیا۔ "وہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ جہاز پر زخمی ہو گئی تھی۔"

"اب وہ کیسی ہے؟"

اس سوال کے جواب میں خالد بولا۔ "اب وہ پہلے سے اچھی ہے لیکن زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوا۔ میں مایا دیوی کا شکر گزار ہوں۔ انھوں نے اس کی تیمارداری میں بہت تکلیف اٹھائی ہے۔"

گنگو نے کہا۔ "جے رام! اگر پرتاپ رائے نے راجہ کے حکم سے جہاز لوٹے ہیں تو مجھے یقین نہیں کہ وہ قیدیوں کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گا۔ میرے خیال میں وہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ یہ خبر سندھ سے باہر نہ نکلے۔ برہمن آباد میں ایسے قید خانے ہیں جہاں سے صرف موت کی صورت میں انسان باہر نکلتے ہیں۔ اس خبر کو مکران یا بصرے

تک پہنچانا ضروری ہے۔ اگران کی حکومت نے مداخلت کی توراجہ یقیناً قیدیوں کو چھوڑ دے گا۔"

جے رام نے کہا۔"اگر خالد جانا چاہے تو میں اسے سرحد کے پار پہنچا دینے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔"

گنگو نے جواب دیا۔"خالد کو میں بھی سرحد کے پار پہنچا سکتا ہوں، لیکن جب تک اس کی بہن تندرست نہیں ہوتی، اس کے لیے جانا ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ عربوں کی فوجیں اس وقت ترکستان اور افریقہ میں لڑ رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ سپاہیوں کی قلت کے پیش نظر سندھ کے ساتھ بگاڑ پسند نہ کریں۔ خالد کا خیال ہے کہ اگر زبیر کسی طرح رہا ہو جائے تو یہ مہم اس کے لیے بہت آسان ہوگی۔ وہ بصرہ اور دمشق کے ہر بااثر آدمی کو جانتا ہے۔"

"جے رام نے کہا۔"اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی جان پر کھیل کر بھی زبیر کو قید سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

مایا نے کہا۔"بھیا! تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ زبیر کی رہائی کی کوشش ضرور کرو۔"

مایا! تمہاری سفارش کے بغیر بھی میرا یہ فرض ہے۔" یہ کہہ کر جے رام گنگو سے مخاطب ہوا۔"اب اگر آپ کی اجازت ہو تو میں مایا سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

گنگو کا اشارہ پا کر اس کے ساتھی وہاں سے کھسک گئے۔ گنگو نے ایک طرف ہو کر خالد سے کہا، تم ناہید کے پاس جاؤ، اور اگر وہ قیدیوں کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتی ہو تو پوچھ آؤ۔"

خالد اندر داخل ہوا تو ناہید دروازے کی آڑ میں کھڑی تھی۔ اس نے کہا۔"ناہید

تمہیں ذرا افاقہ ہوتا ہے۔ تو تم چلنے پھرنے لگتی ہو۔ تمہیں بستر پر لیٹنا چاہیے۔"

ناہید نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا۔"تم نے بیچارے جے رام پر بہت سختی کی۔ اب مایا کے متعلق تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

خالد نے جواب دیا۔"مایا کے متعلق ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ وہ بہن بھائی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ غالباً وہ اس کے ساتھ چلی جائے گی۔ جے رام نے زبیر کو قید سے چھڑانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ رہا ہوتے ہی مکران کے راستے بصرہ پہنچ کر ہماری سرگزشت سنائے گا۔ عورتوں اور بچوں کے رہا ہونے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ ہماری حکومت اس معاملے میں مداخلت کرے۔"

ناہید نے کہا۔"میں یہ باتیں سن چکی ہوں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ جس طرح اباجان کے معاملے میں حکومت سندھ نے مکران کے گورنر کو ٹال دیا تھا۔ اسی طرح یہ معاملہ بھی رفع دفع ہو جائے گا۔ میں نے سنا ہے کہ بصرہ کا حاکم بہت جابر ہے لیکن سندھ کی طرف متوجہ نہ ہونے کے لیے اس کے پاس معقول بہانہ ہے کہ عرب کی تمام افواج ایشیا اور افریقہ میں برسرپیکار ہیں۔"

خالد نے پریشان ہو کر کہا۔"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ لیکن میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں۔ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔"

ناہید نے کہا۔"میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ میں بصرہ کے حاکم کو خط لکھتی ہوں اگر جے رام زبیر کو رہا کروا سکے، تو اسے کہو، یہ خط اس کے حوالے کر دے۔ اگر بالفرض میرا خط حاکم بصرہ کو متاثر نہ کر سکا، تو بصرہ کے عوام اس سے ضرور متاثر ہوں گے۔ میں خواب میں مسلمانوں کو قید خانے کے دروازے توڑتے ہوئے دیکھ چکی ہوں۔ مجھے اپنے خواب کے صحیح ہونے کا یقین ہے۔"

"تو تم اندر جا کر خط لکھو۔ لیکن کس چیز پر لکھو گی؟ ہاں یہ لو میرا رومال۔" خالد نے

اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ناہید کو رومال دیا اور واپس مڑتے ہوئے کہا۔ "تم خط لکھو! میں اتنی دیر جے رام کو روکتا ہوں۔"

باہر مایا اپنے بھائی کو آپ بیتی سنا رہی تھی۔ اختتام پر جے رام نے پوچھا۔ "مایا! تمھیں یہاں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں؟"

"نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "گنگو مجھے اپنی بیٹی سمجھتا ہے۔ ناہید مجھے اپنی چھوٹی بہن خیال کرتی ہے۔"

جے رام نے کہا۔ "مایا! میں تمھیں ایک بہت بری خبر سنانا چاہتا ہوں۔"

مایا نے گھبرا کر پوچھا۔ "وہ کیا؟"

"وہ بات یہ ہے کہ میں تمھیں اس وقت اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ میں نے تمھارے غائب ہونے کی ذمہ داری پرتاپ رائے پر تھوپی تھی۔ لیکن جب اس نے زبیر اور علی کو اذیت دینا شروع کی تو مجھے ان کی جانیں بچانے کے لیے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ تم میرے ساتھ نہ تھیں۔ اب اگر میں تمھیں اپنے ساتھ لے جاؤں تو مجھے ناہید اور خالد کا پتہ بتانے پر مجبور کیا جائے گا۔ میں بذات خود راجہ کی سختی سے نہیں ڈرتا لیکن پرتاپ رائے کو شک ہو جائے گا اور وہ ناہید اور خالد کی تلاش شروع کر دے گا۔ میں یہ نہیں چاہتا، کہ تمھیں دیکھ کر انھیں خالد اور ناہید کے روپوش ہونے کا شک ہو۔ اگر تم چند دن اور یہاں رہنا گوارا کرو، تو پرتاپ رائے غالباً تین چار روز تک واپس دیبل چلا جائے گا۔ اس کے بعد میں تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا۔"

مایا نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بھیا آپ میری فکر نہ کریں۔ میں یہاں ہر طرح خوش ہوں اور جب تک ناہید تندرست نہیں ہوتی۔ میں اسے چھوڑ کر جانا پسند بھی نہیں کروں گی۔"

گنگو اور خالد کچھ فاصلے پر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جے رام نے انھیں آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا اور پھر اشارے سے اپنے پاس بلا لیا جب قریب پہنچے تو اس نے کہا۔ "آپ کو کہیں پھر شک نہ ہو جائے کہ میں کوئی سازش کر رہا ہوں۔ مایا کہتی ہے کہ وہ ناہید کے تندرست ہونے تک یہیں رہنا چاہتی ہے اور میں بھی بعض مصلحتوں کی بنا پر اسے یہاں چھوڑنا چاہتا ہوں۔ میں چند دنوں تک اسے لے جاؤں گا۔ ممکن ہے کہ مجھے بھی زبیر کے ساتھ فرار ہونا پڑے اور میں ہمیشہ کے لیے آپ کے ساتھ آ ملوں۔ اب مجھے دیر ہو رہی ممکن ہے کہ راجہ پرتاپ رائے کے شہر میں پہنچتے ہی ہمیں ملاقات کے لیے بلا لے۔ میرا غیر حاضر ہونا ٹھیک نہیں۔"

خالد نے کہا۔ "آپ ذرا ٹھہریئے۔ ناہید ایک خط لکھ رہی ہے۔ آپ یہ خط زبیر کو آزاد کروانے کے بعد اس کے حوالے کر دیں۔"

"تو جلدی سے وہ خط لے آؤ مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہ برہمن آباد کے قریب پہنچ چکے ہوں گے۔"

گنگو نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ ہم ان سے پہلے تمھیں ایک آسان راستے سے برہمن آباد پہنچا دیں گے۔"

جے رام نے کہا۔ "میں فقط آپ کا ایک ساتھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں، لیکن یہ ضروری ہے کہ برہمن آباد میں اسے کوئی نہ پہچانتا ہو۔ اگر کوئی نازک وقت آیا تو میں اسے آپ کے پاس اطلاع دینے کے لیے روانہ کر دوں گا۔"

گنگو نے کہا۔ "آپ واسو کو لے جائیں۔"

دوپہر کے وقت جے رام واسو کی راہنمائی میں جنگل عبور کر رہا تھا۔

دوست اور دشمن

برہمن آباد سے ایک کوس کے فاصلے پر جے رام کو اپنا قافلہ دکھائی دیا۔ اس نے داسو کے ساتھ قافلے میں شریک ہونا خلافِ مصلحت سمجھتے ہوئے اپنا راستہ تبدیل کر دیا اور دوسرے دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ برہمن آباد میں نرائن داس نامی ایک نوجوان اس کا پُرانا دوست تھا۔ جے رام نے داسو کو اس کے گھر ٹھہرا کر شاہی مہمان خانے کا رُخ کیا۔ تھوڑی دیر بعد پرتاپ رائے سپاہیوں اور قیدیوں سمیت وہاں پہنچ گیا۔ اس نے جے رام کو دیکھتے ہی کہا "مجھ سے تم نے شکار کا بہانہ کیوں کیا؟ تم نے صاف یہ کیوں نہ بتایا کہ تم مجھ سے پہلے مہاراج سے ملنا چاہتے تھے، اب بتاؤ! تمھاری بہن کی کہانی سننے کے بعد مہاراج نے کیا کہا؟"

"میں ابھی تک مہاراج سے نہیں ملا اور نہ میری یہ نیت تھی۔"

پرتاپ رائے نے مطمئن ہو کر کہا "جے رام! میرا خیال ہے کہ اپنی بہن کے غائب ہو جانے کے متعلق تم نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ میں عربوں کے علاوہ سراندیپ کے قیدیوں سے بھی پوچھ چکا ہوں۔ وہ سب تمہارے پہلے بیان کی

تصدیق کرتے ہیں۔ اگر انھوں نے راجہ سے شکایت کی کہ تمھاری بہن کے علاوہ ایک مسلمان لڑکی بھی جہاز سے غائب ہوئی ہے تو ممکن ہے کہ راجہ مجھے اس بات کا ذمّہ دار ٹھہرائے؟"

"میں راجہ کے سامنے بھی یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ میری بہن جہاز پر نہیں تھی اور مسلمان لڑکی کے غائب ہو جانے کا واقعہ بھی صحیح نہیں۔"

"لیکن جب قیدی یہ شکایت کریں گے کہ وہ جہاز سے غائب ہوئی ہیں تو تمھارا بیان راجہ کو مطمئن نہ کر سکے گا۔"

جے رام نے پریشان ہو کر کہا۔ "آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ پہلے آپ نے زبیر اور علی کو اذیت پہنچا کر مجھے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ میری بہن غائب نہیں ہوئی اور اب آپ یہ ثابت کرنے پر مصر ہیں کہ عرب لڑکی اور میری بہن جہاز سے غائب ہوئی ہیں۔"

پرتاپ رائے نے جواب دیا۔ "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون سی مجبوری ہے جس نے تمھیں اپنی بہن کا راز چھپانے پر مجبور کیا ہے؟"

"آپ یہ جانتے ہیں کہ زبیر میرا مہمان تھا۔ اس نے میری جان بچائی تھی اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ اس واقعہ کی آڑ لے کر اُسے اذیت پہنچائیں۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم صرف زبیر کی خاطر اپنے صحیح دعوے سے دستبردار ہوئے۔ تم زبیر کی دوستی پر اپنی بہن کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو لیکن تمھارا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ تمھاری بہن کو میں نے اغوا کیا ہے اور صرف تمھاری بہن ہی نہیں بلکہ ایک عرب لڑکی اور لڑکے کے غائب ہو جانے کی ذمّہ داری بھی مجھ پر ہی عاید ہوتی ہے۔"

جے رام نے جواب دیا۔ "نہیں نہیں!! مجھے آپ کے متعلق جو غلط فہمی تھی، وہ

دُور ہو چکی ہے۔"

"کیسے؟"

جے رام نے اچانک محسوس کیا کہ پرتاپ رائے اس کے لیے پھر ایک پھندا تیار کر رہا ہے۔ اس نے چونک کر کہا۔ "آخر ان باتوں سے آپ کا مطلب ہے میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ میں راجہ کے سامنے اپنی بہن کا ذکر نہیں کروں گا۔"

پرتاپ رائے نے سرد مہری سے کہا۔ "تم جو کچھ خود نہیں کہنا چاہتے وہ عربوں کی زبان سے کہلواؤ گے۔ اس سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پہلے جس راز کو تم ظاہر کرنا چاہتے تھے اسے میں چھپانا چاہتا تھا۔ اب جس راز کو تم چھپانا چاہتے ہو اسے میں ظاہر کرنے پر مجبور ہوں۔ میرے متعلق اگر تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی ہے تو اس کی کوئی وجہ ہے اور میں وہ وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ تم ایک عرب کے لیے اتنی بڑی قربانی دے سکتے ہو۔ کوئی عقل مند آدمی یہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا۔"

"تو تمہارا یہ مطلب ہے کہ میں نے خود اپنی بہن کو کہیں غائب کر دیا ہے؟"

"تمہاری بہن کا مسئلہ میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن عرب لڑکی کا سراغ لگانے کی ذمہ داری مجھ پر عاید ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ تمہاری طرح عربوں نے بھی راجہ کو مجھ سے بدظن کرنے کے لیے ایک لڑکی کے غائب ہو جانے کا بہانہ تراشا ہو لیکن اگر دربار میں اس کے غائب ہو جانے کا سوال اٹھایا گیا تو ہم میں سے ایک کو یہ ذمہ داری اپنے سر لینا پڑے گی۔"

جے رام نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "جس طرح میں نے آپ سے انتقام لینے کے لیے اپنی بہن کے غائب ہو جانے کا جھوٹا افسانہ تراشا تھا۔ اسی طرح انھوں نے مجھے آپ کا شریکِ کار سمجھ کر محض انتقام لینے کے لیے یہ بہانہ تلاش کیا ہے۔ میں

زبیر کو سمجھا سکتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ میرے کہنے پر راجہ کے سامنے جھوٹی شکایت نہیں کرے گا۔"

پرتاپ رائے نے بے رخی سے کہا۔ "تم کسی قیدی سے بات چیت نہیں کر سکتے۔ میں نے سپاہیوں کو حکم دیا ہے کہ راجہ کے سامنے پیش ہونے سے پہلے تمہیں اپنا صندوق کھول کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں۔"

جے رام کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن فوج کے ایک افسر نے آکر پرتاپ رائے کو اطلاع دی کہ مہاراج آپ کو یاد فرماتے ہیں۔"

جے رام نے پرتاپ رائے کے ساتھ جانا چاہا لیکن اس نے کہا۔ "مہاراج نے مجھے یاد فرمایا ہے تمہیں نہیں۔ تم اطمینان سے بیٹھے رہو! جب تمہیں بلایا جائے گا میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گا۔"

پرتاپ رائے جہاز سے لوٹا ہوا مال اٹھوا کر چلا گیا اور جے رام پریشانی کی حالت میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ زبیر باقی قیدیوں کے ساتھ ہی ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ٹہلتے ٹہلتے اندر جھانک کر دیکھا لیکن پہرے دار نے اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ جے رام نے ایک معمولی پہرے دار کا یہ سلوک دیکھ کر زبیر اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو یقین ہونے لگا کہ وہ ان کے ساتھ ایک ہی کشتی میں سوار ہے۔

(۲)

غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے راجہ کے ایک سپاہی نے جے رام کو اطلاع دی کہ مہاراج آپ کو بلاتے ہیں۔ جے رام کاٹھیاوار کے راجہ کے تحائف کا صندوق اٹھوا کر راجہ کے محل میں پہنچا۔ پہرے دار اسے محل کے ایک کمرے میں لے گئے۔

راجہ داہر سنگِ مرمر کے چبوترے کے اُوپر سونے کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پرتاپ رائے کے علاوہ دیبل کا حاکمِ اعلیٰ اور سیناپتی اودھے سنگھ اور اس کا نوجوان بیٹا بھیم سنگھ جو ارُور[1] سے راجہ کے ساتھ آئے تھے، اس کے سامنے کھڑے تھے۔

جے رام نے راجہ کو تین بار جھک کر پرنام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ دو سپاہیوں نے آبنوس کا صندوق راجہ کے سامنے لاکر رکھ دیا۔ جے رام نے راجہ کے حکم سے صندوق کھولا۔ راجہ نے جواہرات پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ پھر پرتاپ رائے کی طرف دیکھا اور جے رام سے سوال کیا۔ "ہم نے سُنا ہے کہ تم عربوں کی حمایت کرنا چاہتے ہو۔ تم نے ہمارے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ ہم عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور تم نے ہمارے وفادار پرتاپ رائے پر تہمت لگانے کے لیے ایک عرب لڑکی اور اپنی بہن کو کہیں چھپا دیا ہے؟"

جے رام نے جواب دیا۔ "اَن داتا! مجھے یہ یقین نہ تھا کہ پرتاپ رائے نے آپ کے حکم سے ان کے جہازوں کو لُوٹا تھا، ان کا دیبل میں ٹھہرنے کا ارادہ نہ تھا۔ انھوں نے مجھے راستے میں بحری ڈاکوؤں سے چھڑایا تھا۔ دیبل میں میں انھیں اپنے مہمان بنا کر لایا تھا اور اپنے مہمانوں کی رکھشا ایک راجپوت کا دھرم ہے۔ عرب لڑکی اور اپنی بہن کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جب جہاز

[1] سندھ کا دارالحکومت ضلع نواب شاہ میں بیرانی کے قریب ایک قدیم شہر کے کھنڈرات موجود ہیں، جسے دلور کہا جاتا ہے۔ بعض محققین کے خیال میں دلور اُرُور کی بگڑی ہوئی صورت ہے لیکن بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ ارور کا شہر موجودہ روہڑی کے آس پاس آباد تھا۔ اور دریائے سندھ نے اُس کا نشان تک نہیں چھوڑا۔

لُوٹے جا رہے تھے میں ایک کوٹھڑی میں بند تھا۔"

"تم نے پرتاپ رائے سے یہ کہا تھا کہ تم نے عربوں کو اس کی قید سے چھڑانے کے لیے یہ بہانہ تراشا تھا؟"

"اَن داتا! میں اس سے انکار نہیں کرتا لیکن ......!"

راجہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم کچھ نہیں سننا چاہتے۔ اگر عربوں نے شکایت کی کہ جہاز پر سے ان کی ایک لڑکی غائب ہوئی ہے تو تمھیں اس لڑکی کو ہمارے حوالے کرنا پڑے گا۔"

"مہاراج! اگر عرب مجھ پر یہ شبہ ظاہر کریں کہ لڑکی کو میں نے اغوا کیا ہے تو میں ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔"

"ہم تمھاری چال اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اگر عربوں نے تمھیں قصوروار نہ ٹھہرایا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے اُن کی مرضی سے لڑکی کو کہیں چھپا رکھا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس ایسے طریقے ہیں۔ جن سے انھیں سچ بولنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔"

"اَن داتا! اگر آپ مجھے قصوروار ٹھہراتے ہیں تو جو سزا جی میں آئے دے لیں، لیکن عربوں کے ساتھ پہلے ہی زیادتی ہو چکی ہے۔"

"تو تم ہمارے دشمنوں کے ساتھ دوستی کا دم بھرتے ہو؟"

"وہ آپ کے دشمن نہیں۔ وہ سندھ کو عرب کا ایک پُرامن ہمسایہ خیال کرتے تھے۔ ورنہ وہ دیبل کے قریب سے بھی نہ گزرتے تھے۔ اگر وہ نیک نیت نہ ہوتے تو جواہرات کا یہ صندوق جو میں مہاراجہ کاٹھیاوار کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، آپ تک نہ پہنچتا۔"

راجہ نے کہا۔ "کاٹھیاوار کے جواہرات سراندیپ کے جواہرات کے مقابلے میں پتھر معلوم ہوتے ہیں۔"

"مہاراج! میں جوہری نہیں، ایک سپاہی ہوں، میں پتھروں کو نہیں پہچانتا لیکن آپ کے دوست اور دشمن کو پہچانتا ہوں۔ میں ان پتھروں کے ساتھ آپ کی خدمت میں مہاراجہ کاٹھیاوار کی دوستی کا پیغام لایا ہوں۔ ان پتھروں کی قیمت اگر ایک کوڑی بھی نہ ہو تو بھی وہ ہاتھ جو آپ کے سامنے یہ ناچیز تحائف پیش کر رہا ہے بہت قیمتی ہے لیکن پرتاپ رائے نے عرب جیسی پُرامن اور طاقتور ہمسایہ سلطنت کے جہاز لوٹ کر جو کچھ آپ کے لیے حاصل کیا ہے۔ وہ آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔ ان داتا! آپ کو مسلمانوں سے دشمنی مول لینے سے پہلے بہت سوچ بچار سے کام لینا چاہیئے۔ ان کا ہاتھ ہر ہاتھ سے مضبوط ہے اور ان کا لوہا ہر لوہے کو کاٹتا ہے۔ وہ جیٹھ کی آندھیوں کی طرح اُٹھتے ہیں اور ساون کے بادلوں کی طرح چھا جاتے۔ ان کے مقابلے پر آنے والوں کو نہ سمندر پناہ دے سکتے ہیں نہ پہاڑ۔ ان کے گھوڑے پانی میں تیرتے اور ہوا میں اُڑتے ہیں۔ آپ نے برسات میں دریائے سندھ کی لہریں دیکھی ہیں، لیکن ان کی فتوحات کا سیلاب اس سے کہیں زیادہ تند اور تیز ہے۔"

راجہ داہر کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس نے چلّا کر کہا "ڈرپوک گیدڑ! تمہاری رگوں میں راجپوت کا خون نہیں۔ میرے ملک میں تمہارے جیسے بزدل آدمی کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔"

"ان داتا! میں اس وقت مہاراجہ کاٹھیاوار کا ایلچی ہوں۔ میں خود ایسے ملک میں نہیں رہنا چاہتا جس میں دوست کو دشمن اور دشمن دوست خیال کیا جائے۔"

"کاٹھیاوار کا راجہ اگر خود بھی یہاں موجود ہوتا تو بھی میں یہ الفاظ سننے کے بعد اس کا سر قلم کروا دیتا۔ پرتاپ رائے! اسے لے جاؤ! ہم کل اس کی سزا کا فیصلہ کریں گے۔ صبح عربوں کے سرغنہ کو ہمارے سامنے پیش کرو۔"

پرتاپ رائے نے سپاہیوں کو آواز دی اور آٹھ آدمی ننگی تلواریں لیے آموجود

ہوئے۔ پرتاپ رائے نے جے رام کو چلنے کا اشارہ کیا، جے رام ننگی تلواروں کے پہرے میں پرتاپ رائے کے آگے چل دیا۔

اودھے سنگھ، جے رام کی تقریر کے دوران میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک سر پھرا نوجوان اس کے اپنے خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس نے کہا "ان داتا! اگر مجھے اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔"

راجہ نے جواب دیا "تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اُسے ایسی سزا دیں گے جو برہمن آباد کے لوگوں کو دیر تک نہ بھولے۔"

اودھے سنگھ نے کہا "لیکن مہاراج! میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے جو کچھ کہا ہے نیک نیتی سے کہا ہے۔ ہمیں چند ہاتھیوں اور جواہرات کے لیے عربوں کے ساتھ دشمنی مول نہیں لینی چاہیئے۔ ہمیں اپنی طاقت پر بھروسہ ہے لیکن عرب نہایت سخت جان دشمن ہیں۔"

راجہ نے کہا "اودھے سنگھ! ایک گیدڑ کی چیخیں سُن کر تم بھی گیدڑ بن گئے۔ یہ عرب اونٹنیوں کا دودھ پینے والے اور جَو کی روکھی سوکھی روٹی کھانے والے ہمارے مقابلے کی جرأت کریں گے؟"

"مہاراج! وہ اونٹنیوں کا دودھ پی کر شیروں سے لڑتے ہیں۔ جَو کی روٹی کھا کر پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ اونٹوں پر چڑھ کر ہمارے ہاتھیوں کے مقابلے کے لیے آئیں گے؟"

"ان داتا! بُرا نہ مانیے! ان کے اونٹ ایران کے ہاتھیوں کو شکست دے چکے ہیں۔"

راجہ نے غصّے میں آ کر کہا۔ "اودھے سنگھ! مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی کہ تم

عربوں کے متعلق سُنی سُنائی باتوں سے مرعوب ہو جاؤ گے۔ ہم عرب کی ساری آبادی سے زیادہ سپاہی میدان میں لا سکتے ہیں۔ راجپوتانہ کے تمام راجہ ہمارے اشارے پر گردنیں کٹوانے کے لیے تیار ہوں گے۔"

اودھے سنگھ نے کہا۔ "مہاراج! مجھے ان کا خوف نہیں لیکن میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ہمیں سوئے ہوئے فتنے کو جگانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ دوسروں کی مدد کے بھروسے پر ایک طاقتور دشمن سے لڑائی مول لینا ٹھیک نہیں۔"

"اودھے سنگھ! تم بار بار کیا کہہ رہے ہو؟ سندھ کے سامنے عرب کے صحرائی ایک طاقتور دشمن کی حیثیت ہرگز نہیں رکھتے۔ آخر عربوں میں کیا خوبی ہے جو ہمارے سپاہیوں میں نہیں؟"

"مہاراج! ایسے دشمن کا کوئی علاج نہیں جو موت سے نہ ڈرتا ہو۔ اگر آپ کو مجھ پر یقین نہ ہو تو آپ قیدیوں میں سے ایک عرب کو لاکر اس کا امتحان لے لیں۔ تلواریں ان کے کھلونے ہیں۔"

راجہ نے اودھے سنگھ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کیوں بھیم سنگھ! تمھارا بھی یہی خیال ہے کہ ہمارے سپاہی عربوں کے مقابلے میں کمزور ہیں؟"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "مہاراج! پتا جی عربوں کے ساتھ پر امن رہنے میں بھلائی سمجھتے ہیں، ورنہ ہم نے بھی تلواروں کے سائے میں پرورش پائی ہے۔ اگر عرب موت سے نہیں ڈرتے تو ہمیں مارنے سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔"

راجہ نے کہا۔ "شاباش! دیکھا اودھے سنگھ! تمھارا بیٹا تم سے بہادر ہے۔"

اودھے سنگھ نے جواب دیا۔ "مہاراج کے منہ سے یہ سُن کر مجھے خوش ہونا چاہیے لیکن سیناپتی کے فرائض کا احساس مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں مہاراج کے سامنے آنے والے خطرات کو گھٹا کر پیش نہ کروں۔ بھیم سنگھ ابھی بچہ ہے۔ اُس نے

عربوں کو لڑتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن میں مکران کی جنگ میں یہ دیکھ چکا ہوں کہ عام عرب سپاہی ہمارے بڑے سے بڑے پہلوان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ مکران پر عربوں نے کل چھ سو سواروں کے ساتھ حملہ کیا تھا اور راجہ کے چار ہزار سپاہیوں کو تنکوں کی طرح بہا لے گئے تھے۔ جے رام کو آپ دیر سے جانتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں میں اس سے بڑھ کر تلوار کا دھنی اور کوئی نہیں۔ اگر وہ عربوں سے اس قدر مرعوب ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ بزدل یا مہاراج کا نمک حرام ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ عربوں سے بگاڑ کے خطرے کا صحیح اندازہ کر چکا ہے۔"

راجہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم میرے سیناپتی ہو وزیر نہیں اور میں ان معاملات میں تمھاری سمجھ سے کام نہیں لینا چاہتا۔ اگر بڑھاپے میں تمھاری ہمت جواب دے چکی ہے تو تمھیں اس عہدہ سے سبکدوش کیا جا سکتا ہے اور تمھیں یہ بھی حق نہیں کہ تم جے رام جیسے سرکش، گستاخ اور بزدل کی سفارش کرو۔ وہ جو کچھ ہمارے سامنے کہہ چکا ہے وہ اسے بڑی سے بڑی سزا دینے کے لیے کافی ہے۔"

اودھے سنگھ راجہ کے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ اس نے کہا۔ "مہاراج! میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو میرے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے اتنی باتیں کرنے کی جرأت اس لیے کی کہ ابھی تک آپ نے عرب کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کیا اگر آپ اعلانِ جنگ کر چکے ہوں تو میرا فرض ہے اور صرف میرا ہی فرض نہیں بلکہ ہر سپاہی کا یہ فرض ہے کہ آپ کی فتح کے لیے اپنی جان قربان کر دے۔ جے رام کی گستاخی کا مجھے افسوس ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وقت آنے پر وہ بھی ایک وفادار راجپوت ثابت ہوگا۔ اگر آپ عربوں کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو ہمیں آج ہی تیاری شروع کر دینی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم عربوں کو ایسی شکست دیں کہ وہ پھر سر اٹھانے کے قابل نہ ہو سکیں۔

اس مقصد کے لیے ہمیں افواج منظم کرنے کے علاوہ شمالی اور جنوبی ہندوستان کے تمام چھوٹے اور بڑے راجوں کا تعاون حاصل کرنا چاہیے۔ وہ سب آپ کا لوہا مانتے ہیں اور آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر لڑنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھیں گے۔ ہمیں کاٹھیاواڑ کے راجہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے آپ کو تحائف نہیں بھیجے، خراج بھیجا ہے۔ اگر آپ جے رام کا جرم معاف کر دیں تو اس کی وساطت سے جنگ میں بھی مہاراجہ کاٹھیاوار کا تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

راجہ نے قدرے مطمئن ہو کر کہا۔ "اب تم ایک راجپوت کی طرح بول رہے ہو لیکن جے رام عربوں کے ساتھ مل چکا ہے۔ اگر اسے معاف بھی کر دیا جائے تو اس بات کا کیا ثبوت کہ وہ ہمارے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا۔ ہاں! میں نے سنا ہے کہ وہ ایک عرب نوجوان کی دوستی کا دم بھرتا ہے۔ اگر وہ اس کے ساتھ لڑنے کے لیے تیار ہو جائے اور اسے تلوار کے مقابلے میں مغلوب کرے تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

"مہاراج! وہ آپ کا اشارہ پا کر پہاڑ کے ساتھ ٹکر لگانے کے لیے بھی تیار ہو گا۔"

"بہت اچھا! ہم تمہاری سفارش پر اسے موقع دیں گے۔ کل ہم جے رام کی نیک نیتی کے علاوہ تلوار چلانے میں ایک عرب کی مہارت بھی دیکھ لیں گے۔"

راجہ نے اس کے بعد مجلس برخاست کی اور اٹھ کر محل کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

(۳)

اگلے دن راجہ داہر نے برہمن آباد کے محل کے ایک کشادہ کمرے میں دربار

منعقد کیا۔ سندھ کے دارالحکومت اروڑ سے اس کا وزیر بھی برہمن آباد پہنچ چکا تھا وزیر، سیناپتی اور برہمن آباد کے اُمرا حسبِ مراتب تخت کے قریب کرسیوں پر رونق افروز تھے۔ وزیر اور سیناپتی کے بعد تیسری کرسی جس پر پہلے برہمن آباد کا گورنر بیٹھتا تھا۔ اب دیبل کے گورنر کو دی گئی تھی اور برہمن آباد کا گورنر راجہ سے چند بالشت دور ہو جانے پر یہ محسوس کر رہا تھا کہ قدرت نے راجہ اور اس کے درمیان پہاڑ کھڑے کر دیے ہیں۔ راجہ کے بائیں ہاتھ پانچویں کرسی پر بھیم سنگھ براجمان تھا۔ باقی اُمرا بائیں طرف دوسری قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسیوں کے پیچھے پندرہ بیس عہدے دار دائیں بائیں دو قطاروں میں کھڑے تھے۔ تخت پر راجہ کے دائیں اور بائیں دو رانیاں رونق افروز تھیں۔ ایک حسین و جمیل لڑکی راجہ کے پیچھے صراحی اور جام لیے کھڑی تھی۔ درباری شاعر نے مترنم آواز میں راجہ کی تعریف میں چند اشعار پڑھے۔ اس کے بعد کچھ دیر رقص و سرود کی محفل گرم رہی۔ راجہ نے شراب کے چند جام پیے اور قیدیوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ سپاہی زبیر کو پابہ زنجیر دربار میں لے آئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد جے رام داخل ہوا۔ زبیر کی طرح اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیریں نہ تھیں لیکن اس کے آگے پیچھے ننگی تلواروں کا پہرہ زبیر کو یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ اس کی حالت اس سے مختلف نہیں۔

راجہ نے پرتاپ رائے کی طرف دیکھا۔ "یہ ہماری زبان جانتا ہے؟"

اس نے اٹھ کر جواب دیا۔ "جی مہاراج! یہ اجنبی زبانیں سیکھنے میں بہت ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔"

راجہ نے زبیر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"زبیر!" اس نے جواب دیا۔

راجہ نے کہا۔ "ہم نے سنا ہے کہ تم ہم سے بات کرنے کے لیے بہت

بے چین تھے۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دیبل کی بندرگاہ پر ہمارے جہاز کیوں لُوٹے گئے اور ہمیں قیدی بنا کر ہمارے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟"

راجہ نے قدرے بے چین ہو کر جواب دیا۔" نوجوان! ہم پہلے سن چکے ہیں کہ عربوں کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں لیکن تمھیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خاطر ذرا ہوش سے کام لینا چاہیے۔"

زبیر نے کہا۔" ہمارے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، اگر آپ کو اس کا علم نہیں تو یہ اور بات ہے، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ دیبل کے گورنر نے بغیر کسی وجہ کے ہم پر دست درازی کی۔ اگر آپ کو ہمارے متعلق کوئی غلط فہمی ہو تو ہم اسے دور کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اگر سندھ کی طرف سے یہ قدم ہماری غیرت کا امتحان لینے کی نیت سے اٹھایا گیا ہے، تو ہم والیِ سندھ کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہم ہندوستان کے اچھوت نہیں جن کی فریاد ان کے گلے سے باہر نہیں آ سکتی۔ آج تک ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی جرأت کسی نے نہیں کی اور سندھ کی سلطنت کو میں ایسی سلطنت نہیں سمجھتا، جو ایران کی زرہیں اور روما کے خود کاٹنے والی شمشیروں کی ضرب برداشت کر سکے۔ وہ قوم جو روئے زمین کے ہر مظلوم کی دادرسی اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اپنی بہو بیٹیوں کی بے عزتی پر خاموش نہیں بیٹھے گی۔"

راجہ نے وزیر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔" سنو! ایک قیدی ہمارے خلاف اعلانِ جنگ کر رہا ہے۔"

وزیر نے جواب دیا۔" مہاراج! یہ عرب بہت باتونی ہیں۔ ایران اور روم کی فتوحات نے انھیں مغرور بنا دیا ہے لیکن انھیں سندھ کے شیروں سے واسطہ نہیں پڑا۔"

زبیر نے جواب دیا۔" ہم نے دیبل میں شیروں کی شجاعت نہیں دیکھی، لومڑیوں کی مکاّری دیکھی ہے۔"

زبیر کے ان الفاظ کے بعد تمام درباری ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اودھے سنگھ موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے اٹھا اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگا۔" مہاراج! چند دن قید میں رہ کر یہ نوجوان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے اور پھر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ جس سپاہی کی تلوار کند ہو۔ اس کی زبان بہت تیز ہوتی ہے۔"

زبیر غصّے کی حالت میں اودھے سنگھ کی دوستانہ مداخلت کا مطلب نہ سمجھ سکا اور بولا۔" مجھ پر پیچھے سے وار کیا گیا ہے، ورنہ میری تلوار کے متعلق تمھاری یہ رائے نہ ہوتی۔"

پرتاپ رائے نے اُٹھ کر کہا۔" مہاراج! یہ جھوٹ کہتا ہے۔ ہم نے اسے لڑ کر گرفتار کیا تھا۔"

زبیر نے غصّے اور حقارت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔" بزدل آدمی! تم انسانیت کا ذلیل ترین نمونہ ہو۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود تمھارے چہرے پر خوف و ہراس کے آثار ظاہر ہیں۔ لومڑی شیر کو پنجرے میں بھی دیکھ کر بدحواس ہے۔ میرا صرف ایک ہاتھ کھول دو اور مجھے میری تلوار دے دو۔ پھر ان سب کو میرے اور تمھارے دعوےٰ کی صداقت معلوم ہو جائے گی۔"

پرتاپ رائے پھٹی پھٹی نگاہوں سے حاضرینِ دربار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برہمن آباد کا گورنر زبیر کی آمد کو تائیدِ غیبی سمجھ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر دربار کا سکوت توڑا اور کہا۔" مہاراج! یہ کھشتری دھرم کی توہین ہے کہ ایک معمولی عرب بھرے دربار میں سردار پرتاپ رائے کو بزدلی کا طعنہ دے۔ آپ سردار پرتاپ رائے کو اجازت دیں کہ وہ اس کا دعویٰ جھوٹ ثابت کر دکھائیں۔"

اودھے سنگھ کو پرتاپ رائے سے کم نفرت نہ تھی لیکن وہ جے رام کو راجہ کے عتاب سے بچانا زیادہ ضروری خیال کرتا تھا اور اُسے بچانے کی اس کے ذہن میں یہی صورت تھی کہ جے رام زبیر کا مقابلہ کر کے راجہ کے شکوک رفع کر دے کہ وہ عربوں کا دوست ہے۔ اس نے اُٹھ کر کہا۔ "مہاراج! برہمن آباد کے حاکم کا خیال درست نہیں۔ سردار پرتاپ رائے کا رتبہ ایسا نہیں کہ وہ ایک معمولی عرب سے مقابلہ کریں، یہ ان کی توہین ہے۔ اس نوجوان کی خواہش پوری کرنے کے لیے ہمارے پاس ہزاروں نوجوان موجود ہیں۔ اگر مہاراج کو ناگوار نہ ہو تو آپ جے رام کو ثابت کرنے کا موقع دیں کہ وہ ملیچھ عربوں کا دوست نہیں۔"

راجہ نے جواب دیا۔ "تم کئی بار جے رام کی سفارش کر چکے ہو لیکن اس کی باتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ عربوں سے بہت زیادہ مرعوب ہے۔ کیوں جے رام! تم اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے تیار ہو؟"

جے رام نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ "مہاراج! میں آپ کے اشارے پر آگ میں کود سکتا ہوں لیکن زبیر میرا مہمان ہے اور میں اس پر تلوار نہیں اٹھا سکتا۔"

دربار میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ اودھے سنگھ نے دل برداشتہ ہو کر جے رام کی طرف دیکھا۔ راجہ نے چلّا کر کہا۔ "اس گدھے کو میرے سامنے سے لے جاؤ۔ اس کا منہ کالا کر کے پنجرے میں بند کر دو اور شہر کی گلیوں میں پھراؤ۔ کل اسے مست ہاتھی کے سامنے ڈالا جائے گا۔ اودھے سنگھ! تم نے اس عرب کے سامنے ہمیں شرمسار کیا اور پرتاپ رائے! تم چپ کیوں بیٹھے ہو۔ تم دیبل میں اسے نیچا دکھا چکے ہو۔ اب تمھاری تلوار نیام سے باہر کیوں نہیں آتی؟ تم سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا؟"

نوجوان بھیم سنگھ نے اُٹھ کر تلوار بے نیام کی اور کہا۔ "مہاراج! مجھے اجازت

دیجیے!"

بھیم سنگھ کی دیکھا دیکھی تمام درباریوں نے تلواریں کھینچ لیں۔ سب سے آخر میں پرتاپ رائے نے تلوار نکالی لیکن اس کی نگاہیں راجہ سے کہہ رہی تھیں۔ "ان داتا! میرے حال پر رحم کرو۔" درباریوں کو راجہ کے اشارے کا منتظر دیکھ کر زبیر نے اپنے ہونٹوں پر ایک حقارت آمیز مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "بس اب جانے دیجیے! مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اپنے حریف کو پابہ زنجیر دیکھ کر آپ کے درباری بزدل کہلانا پسند نہیں کرتے لیکن قدرت لومڑیوں کے سامنے شیروں کو ہمیشہ باندھ کر پیش نہیں کرتی۔"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "مہاراج! اس کی بیڑیاں کھلوا دیجیے۔ میں اسے ابھی بتا دوں گا کہ شیر کون ہے اور لومڑی کون!"

(۴)

راجہ کے اشارے پر سپاہیوں نے زبیر کی بیڑیاں اتار دیں اور اس کے ہاتھ میں ایک تلوار دے دی گئی لیکن وزیر نے کہا۔ "مہاراج! آپ کے دربار میں مقابلہ ٹھیک نہیں۔"

راجہ نے جواب دیا۔ "ٹھیک کیوں نہیں؟ اسی دربار میں ہمارے سپاہیوں کو بزدلی کا طعنہ دیا گیا ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہیں اس کا انتقام لیا جائے۔"

"مہاراج! انتقام اس نوجوان کو لڑنے کا موقع دیے بغیر بھی لیا جا سکتا ہے۔"

راجہ نے جواب دیا۔ "نہیں! ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ عرب تلوار کس طرح چلاتے ہیں۔"

بھیم سنگھ کرسیوں کے درمیان کھلی جگہ میں آ کھڑا ہوا اور اس نے تلوار کے اشارے سے زبیر کو سامنے آنے کی دعوت دی۔

زبیر نے راجہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اس نوجوان کے ساتھ مجھے کوئی دشمنی نہیں۔ میرا مجرم پرتاپ رائے ہے۔ آپ اسے قربانی کا بکرا کیوں بناتے ہیں؟"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "بزدل! تم صرف باتیں کرنا جانتے ہو۔ اگر ہمّت ہے تو سامنے آؤ۔"

"اگر تم دوسرے کا بوجھ اٹھانے پر بضد ہو تو تمھاری مرضی۔" یہ کہتے ہوئے زبیر آگے بڑھ کر بھیم سنگھ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ راجہ کے حکم سے سپاہی تخت اور کرسیوں کے آگے نصف دائرے میں کھڑے ہو گئے۔ اودھے سنگھ نے اٹھ کر کہا۔ "بیٹا! اوچھا وار نہ کرنا۔ تم ایک خطرناک دشمن کے سامنے کھڑے ہو۔"

"پتا جی! آپ فکر نہ کریں۔" یہ کہتے ہوئے بھیم سنگھ نے یکے بعد دیگرے تین چار وار کر دیے۔ زبیر اس حملے کی غیر متوقع شدت سے دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا اور اہلِ دربار نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ زبیر کچھ دیر بھیم سنگھ کے وار روکنے پر اکتفا کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد تماشائی یہ محسوس کرنے لگے کہ حملہ کرنے والے ہاتھ سے حملہ روکنے والا ہاتھ کہیں زیادہ پھرتیلا ہے۔ اودھے سنگھ پھر چلایا۔ "بیٹا! جوش میں نہ آؤ! تلوار کا ٹھنڈا کھلاڑی ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔"

لیکن زبیر کے چہرے کی پُرسکون مسکراہٹ نے بھیم سنگھ کو اور زیادہ سیخ پا کر دیا اور وہ اندھا دھند وار کرنے لگا۔ اسے آپے سے باہر آتا دیکھ کر زبیر نے یکے بعد دیگرے چند وار کیے اور بھیم سنگھ کو جارحانہ حملوں سے مدافعت پر مجبور کر دیا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ بھیم سنگھ کی تلوار بروقت مدافعت کے لیے نہ اُٹھ سکی لیکن زبیر کی تلوار اسے گھائل کرنے کی بجائے اس کے جسم کے کسی حصّے کو چھونے کے

بعد واپس چلی گئی۔ درباری اب یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ جان بوجھ کر بھیم سنگھ کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بھیم سنگھ کو خود بھی اس کی برتری کا احساس ہو چکا تھا لیکن وہ اعترافِ شکست پر موت کو ترجیح دینے کے لیے تیار تھا۔ پرتاپ رائے بھیم سنگھ کے باپ سے پرانی رنجشوں کے باوجود انتہائی خلوص سے بھیم سنگھ کی فتح کی دُعائیں کر رہا تھا لیکن بھیم سنگھ کے بازو ڈھیلے پڑ چکے تھے، راجہ اور اہلِ دربار کے چہروں پر مایوسی چھا رہی تھی۔

اودھے سنگھ نے کہا۔ "مہاراج! بھیم سنگھ اپنی جان دے دے گا لیکن پیچھے نہیں ہٹے گا۔ آپ اس کی جان بچا سکتے ہیں۔"

بڑی رانی نے اودھے سنگھ کی سفارش کی لیکن چھوٹی رانی نے کہا۔ "مہاراج! سپاہیوں کو بھیم سنگھ کی مدد کا حکم دینا انصاف نہیں۔ اپنے بیٹے کے لیے اودھے سنگھ کے بیٹے نے جوش مارا ہے لیکن جب وہ پردیسی دو قدم پیچھے ہٹا تھا، اس پر کسی کو رحم نہ آیا۔ اگر آپ بچانا چاہتے ہیں تو دونوں کی جان بچائیے!"

راجہ تذبذب کی حالت میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اچانک زبیر پے در پے چند سخت وار کرنے کے بعد بھیم سنگھ کو چاروں اطراف سے دھکیل کر اس کی خالی کرسی کے سامنے لے آیا۔ سپاہی جو ننگی تلواریں لیے قطار میں کھڑے تھے۔ اِدھر اُدھر سمٹ گئے۔ بھیم سنگھ لڑکھڑاتا ہوا پیٹھ کے بل کرسی میں گر پڑا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن زبیر نے اس کے سینے پر تلوار کی نوک رکھتے ہوئے کہا۔ "تم اگر چند سال اور زندہ رہو تو ایک اچھے خاصے سپاہی بن سکتے ہو لیکن سرِدست تمھاری جگہ یہ کرسی ہے۔"

بھیم سنگھ کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور وہ غصّے اور ندامت کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

راجہ نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا لیکن ان کی تلواریں بلند ہونے سے پہلے زبیر بھیم سنگھ کی کرسی کے اوپر سے کود کر پرتاپ رائے کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور بیشتر اس کے کہ پرتاپ رائے اپنی بدحواسی پر قابو پاتا۔ زبیر نے اپنی تلوار کی نوک اس کی پیٹھ پر رکھتے ہوئے راجہ سے کہا۔ "اپنے سپاہیوں کو وہیں کھڑا رہنے کا حکم دیجیے! ورنہ میری تلوار اس موذی کے سینے کے پار ہو جائے گی۔"

راجہ کے اشارے پر سپاہی پیچھے ہٹ گئے تو زبیر نے پھر راجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بے وقوفوں کے بادشاہ! مجھے تم سے نیک سلوک کی توقع نہیں لیکن میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ جن صلاح کاروں نے تمھیں عرب کے ساتھ لڑائی مول لینے کا مشورہ دیا ہے، وہ تمھارے دوست نہیں۔ جن لوگوں پر تمھیں بھروسہ ہے، وہ سب دیبل کے حاکم کا دل و دماغ رکھتے ہیں۔ اس کی طرف دیکھو، یہ وہ بہادر ہے جو کرسی پر بیٹھا ہوا بید مجنوں کی طرح کانپ رہا ہے۔ اب میں تمھارے سامنے اس شخص سے چند سوالات کرتا ہوں۔ "کیوں پرتاپ رائے! تم نے مجھے لڑ کر گرفتار کیا تھا یا دوستی کا فریب دے کر جہاز سے بلایا تھا؟ جواب دو، خاموش کیوں ہو! اگر تم نے جھوٹ بولا تو یاد رکھو، ان سپاہیوں کی حفاظت سے تم نہیں بچ سکتے۔

بولو!" یہ کہتے ہوئے زبیر نے تلوار کو آہستہ سے جنبش دی اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے تمھیں جہاز پر سے بلایا تھا لیکن مہاراج کا یہی حکم تھا کہ تمھیں ہر قیمت پر گرفتار کیا جائے۔"

راجہ نے کہا۔ "ٹھہرو! پرتاپ رائے نے ہمارے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اگر تم نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو قیدیوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے

گا۔ جسے تم تصور میں بھی برداشت نہ کر سکو گے۔ ابھی ہم نے تمھارے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ہم خواہ مخواہ عرب کے ساتھ بگاڑ نہیں چاہتے۔ تمھاری قوم واقعی بہادر ہے لیکن اگر تم ذرا سمجھ سے کام لو تو ممکن ہے ہم تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو آزاد کر دیں۔ تمھارے سر پر اس وقت بیس سپاہی کھڑے ہیں۔ تم زیادہ سے زیادہ ایک کو مار سکو گے لیکن اس وقت ایک آدمی کے بدلے ہم تمام قیدیوں کو پھانسی دے دیں گے۔ اگر اپنے ساتھیوں کی خیر چاہتے ہو تو تلوار پھینک دو!"

زبیر نے کہا۔ "مجھے تم میں سے کسی پر اعتبار نہیں لیکن میں تمھیں اپنا نفع اور نقصان سوچنے کا آخری موقع دیتا ہوں۔ یاد رکھو! اگر تم نے میرے ساتھیوں کے ساتھ بدسلوکی کی تو وہ دن دور نہیں۔ جب تمھارے ہر سپاہی کے سر پر میرے جیسے سرپھروں کی تلواریں چمک رہی ہوں گی۔ تمھیں اگر جواہرات اور ہاتھیوں کا لالچ ہے تو میں ان کا مطالبہ نہیں کرتا۔ میں صرف یہ درخواست کرتا ہوں کہ تم مجھے اور میرے ساتھیوں کو رہا کر دو، خالد اور اس کی بہن کو ہمارے حوالے کر دو!"

راجہ نے جواب دیا۔ "جب تک تم تلوار نہیں پھینکتے، ہم تمھاری کسی درخواست پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں۔"

زبیر کو راجہ کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ اگر اُسے اپنے ساتھیوں کا خیال نہ آتا تو وہ یقیناً اپنے آپ کو راجہ کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے بہادرانہ موت کو ترجیح دیتا لیکن بیوہ عورتوں اور یتیم بچّوں کے عبرتناک انجام کے تصور نے اس کا جوش ٹھنڈا کر دیا۔ اسے ناہید کا خیال آیا اور اس کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ مختلف خیالات کے گرداب میں راجہ کے

حوصلہ افزا کلمات اُس کے لیے تنکوں کا سہارا ثابت ہوئے اور اس نے اپنی تلوار تخت کے سامنے پھینک دی۔ راجہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ پرتاپ رائے کی حالت اُس شخص سے مختلف نہ تھی جو بھیانک سپنا دیکھنے کے بعد نیند سے بیدار ہوا ہو۔ بڑی رانی نے راجہ کے دائیں کان میں کچھ کہا۔ ”مہاراج! ایسے لوگوں سے دشمنی مول لینا ٹھیک نہیں۔“

راجہ نے اشارے سے وزیر کو اپنے پاس بلایا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”تمھارا کیا خیال ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”مہاراج! مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔“

راجہ نے کہا۔ ”اگر میں اسے چھوڑ دوں تو یہ سردار اور میری رعایا مجھے بزدل تو خیال نہ کریں گے؟“

”مہاراج! چاند پر تھوکنے سے اپنے منہ پر چھینٹے پڑتے ہیں۔ آپ اپنی رعایا کی نظر میں ایک دیوتا ہیں لیکن اب ان قیدیوں کو چھوڑنا مصلحت کے خلاف ہے۔ عربوں کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ سندھ پر حملہ کریں۔ لیکن ان لوگوں کو اگر ان کے ملک میں واپس بھیج دیا گیا تو یہ تمام عرب میں ہمارے خلاف آگ کا طوفان کھڑا کر دیں گے۔ اگر آپ عربوں کے ساتھ جنگ کر کے مکران کا علاقہ حاصل کرنے کا ارادہ بدل چکے ہیں تو بہتر یہی ہے کہ ان سب کو آزاد کرنے کی بجائے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے تاکہ عربوں کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہ ہو کہ ہم نے دیبل سے ان کے جہاز لوٹے ہیں۔ اس سے پہلے ہم ابوالحسن کے معاملے میں مکران کے گورنر کو ٹال چکے ہیں۔ اب بھی اگر کوئی اُن کا پتہ پوچھنے آیا تو اُس کی تسلی کر دی جائے گی۔“

راجہ نے کہا۔ ”تمھیں کس نے بتایا کہ ہم مکران کو فتح کرنے کا ارادہ

بدل چکے ہیں۔“

وزیر نے جواب دیا۔ ”مہاراج! اگر آپ کا ارادہ نہیں بدلا تو پھر ان لوگوں کے متعلق سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں اُس کی کم سے کم سزا یہ ہو سکتی ہے کہ شہر کے کسی چوراہے میں پھانسی دی جائے تاکہ ہمارے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ عرب عام انسانوں سے مختلف نہیں!“

راجہ نے کہا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے لیکن جہاز سے ایک عرب لڑکا اور لڑکی غائب ہو چکے ہیں اگر انھوں نے سندھ کی حدود پار کر کے مکران میں اور عربوں کو یہ خبر پہنچا دی تو ممکن ہے کہ ہمیں بہت جلد لڑائی کی تیاری کرنی پڑے۔“

وزیر نے جواب دیا۔ ”مہاراج! عرب کی موجودہ حالت مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ ان کی خانہ جنگی کو ختم ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی اور اب ان کی تمام افواج شمال اور مغرب کے ممالک میں لڑ رہی ہیں۔ ہمارے پاس ایک لاکھ فوج موجود ہے اور ہم ضرورت کے وقت اسی قدر اور سپاہی جمع کر سکتے ہیں۔ پھر راجپوتانے کے تمام راجہ آپ کے باجگزار ہیں۔ وہ آپ کے جھنڈے تلے عربوں سے لڑنا اپنی عزت سمجھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ جو عرب سندھ میں آئے گا، واپس نہیں جائے گا۔“

”شاباش! مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ تم آج ہی تیاری شروع کر دو۔“

راجہ سے کانا پھوسی ختم کرنے کے بعد وزیر اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔

راجہ نے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اسے لے جاؤ! آج شام تک ہم اس کا فیصلہ کر دیں گے۔"

آخری اُمید

رات کے وقت سونے سے پہلے داسو نے کئی بار نرائن داس سے جے رام کے واپس نہ آنے کی وجہ پوچھی لیکن اس نے ہر بار یہی جواب دیا کہ شہر میں اُس کے کئی دوست ہیں۔ کسی نے اسے اپنے پاس ٹھہرا لیا ہو گا۔ داسو کو جے رام کی ہدایت تھی کہ وہ اس کے واپس آنے تک نرائن داس کے گھر سے باہر نہ نکلے۔ اگلے دن بھی اس نے طوعاً و کرہاً جے رام کی اس ہدایات پر عمل کیا۔ شام سے کچھ دیر پہلے نرائن داس نے آکر یہ خبر دی کہ جے رام کو ایک عرب کے ساتھ پنجرے میں بند کر کے شہر میں پھرایا جا رہا ہے اور صبح سورج نکلنے سے پہلے ان دونوں کو شہر کے چوراہے میں پھانسی دے دی جائے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ اس نے بھرے دربار میں راجہ کے سامنے گستاخی کی ہے۔

داسو نے یہ سنتے ہی شہر کا رُخ کیا۔ لوگ شہر کے ایک پُر رونق چوراہے میں ایک بانس کے پنجرے کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ داسو اپنے مضبوط بازوؤں سے لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا پنجرے کے قریب پہنچا اور پنجرے کے اندر زبیر اور جے رام کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اُلٹے پاؤں لوٹ آیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھوڑے پر سوار

ہو کر جنگل کا رُخ کر رہا تھا۔

شہر میں آدھی رات تک چند پہریداروں کے سوا تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جے رام زبیر کو جنگل میں خالد، ناہید اور مایا سے ملاقات کا واقعہ سُنا چکا تھا۔ چند پہرے دار سو چکے تھے اور باقی پنجرے کے قریب بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ زبیر نے موقع پا کر کہا۔ "وہ رومال کہاں ہے؟"

جے رام نے جواب دیا۔ "وہ میری کلائی کے ساتھ بندھا ہوا ہے لیکن ہم دونوں کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے ہیں۔ کاش! داسو کو ہماری خبر ہو جاتی۔ زبیر! زبیر!! میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں!"

"پوچھو!"

"ہمیں سورج نکلنے سے پہلے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ تمہیں اس وقت سب سے زیادہ کس بات کا خیال آرہا ہے؟"

"میرے دل میں صرف ایک خیال ہے اور وہ یہ کہ میں اب تک خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خوش کرنے کے لیے دُنیا میں کوئی مفید کام نہیں کر سکا۔"

"تمہیں مرنے کا خوف تو ضرور ہوگا؟"

"ایک مسلمان کے ایمان کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ موت سے نہ ڈرے اور ڈرنے سے فائدہ ہی کیا۔ انسان خواہ کچھ کرے۔ جو رات قبر میں آنی ہو، قبر ہی میں آئے گی۔ اگر میری زندگی کے دن پُورے ہو چکے ہیں تو میں آنسو بہا کر انہیں زیادہ نہیں کر سکتا لیکن مجھے ایک افسوس ہے کہ ایسی موت ایک سپاہی کی شان کے شایاں نہیں!"

جے رام نے کہا۔ "مجھے ابھی تک یہ خیال آرہا ہے کہ شاید ہم اس سزا سے

بچ جائیں۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ شاید ابھی بھونچال کے جھٹکے سے یہ شہر مٹی کا ایک ڈھیر بن جائے گا۔ کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ شاید بھگوان کا کوئی اوتار آسمان سے اتر کر راجہ سے کہے کہ ان بے گناہوں کو چھوڑ دو، ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ کبھی مجھے یہ امید سہارا دیتی ہے کہ شاید دریائے سندھ اپنا راستہ چھوڑ کر دیبل کا رُخ کر لے اور لوگ بدحواس ہو کر شہر سے بھاگ نکلیں اور جاتے جاتے ہمیں آزاد کر جائیں۔ تمہیں اس قسم کا کوئی خیال نہیں آتا؟"

"نہیں! مجھے ایسے خیالات پریشان نہیں کرتے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر خدا کو میرا زندہ رکھنا منظور ہے تو وہ ہزار طریقوں سے میری جان بچا سکتا ہے اور اگر میری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں تو میری کوئی تدبیر مجھے موت کے پنجے سے نہیں چھڑا سکتی۔"

جے رام نے کہا۔ "زبیر! کاش میں تمہاری طرح سوچ سکتا لیکن میں جوان ہوں اور ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تم بھی جوان ہو لیکن تمہارے سوچنے کا ڈھنگ مجھ سے مختلف ہے۔"

زبیر نے کہا۔ "تم بھی اگر میری طرح سوچنے کی کوشش کرو تو دل میں تسکین محسوس کرو گے۔"

جے رام نے جواب دیا۔ "یہ میرے بس کی بات نہیں۔"

زبیر نے کہا۔ "جے رام! میری ایک بات مانو گے؟"

"وہ کیا؟"

"صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ میری اور تمہاری زندگی کے شاید تھوڑے سانس باقی ہیں۔ میرے دل پر صرف ایک بوجھ ہے اور اگر تم چاہو تو میں موت سے پہلے اس بوجھ کو اپنے دل سے اُتار سکتا ہوں!"

جے رام نے کہا۔" میں اس پنجرے میں تمھارے لیے جو کچھ کر سکتا ہوں' اس کے لیے تیار ہوں۔"

"جے رام! ہم نے زندگی کی چند منازل ایک دوسرے کے ساتھ طے کی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد ہمارے راستے مختلف ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ اگر تم اس وقت بھی کلمۂ توحید پڑھ لو تو میری گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی ہو جائے گی۔ اب اتنا وقت نہیں کہ میں تمھیں اسلام کی تمام خوبیوں سے آگاہ کر سکوں۔ کاش! میں جہاز پر اس ذمہ داری کو محسوس کرتا لیکن اگر تم میری باتوں پر توجہ دو تو مجھے یقین ہے کہ تم جیسے نیک دل اور صداقت دوست آدمی کو صحیح راہ دکھانے کے لیے ایک لمبے عرصے کی ضرورت نہیں۔"

جے رام نے کہا۔" اگر تمھاری باتیں مجھے موت کے خوف سے نجات دلا سکتی ہیں۔ تو میں سننے کے لیے تیار ہوں۔"

زبیر نے کہا۔" اسلام انسان کے دل میں صرف ایک خدا کا خوف پیدا کرتا ہے اور اُسے ہر خوف سے نجات دلاتا ہے۔ سنو!" یہ کہہ کر زبیر نے نہایت مختصر طور پر اسلام کی تعلیم پر روشنی ڈالی۔ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے حالات بیان کیے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی سیرت پر روشنی ڈالنے کے لیے اسلام کی ابتدائی تاریخ کے واقعات بیان کیے۔ اختتام پر زبیر اجنادین، یرموک اور قادسیہ کی جنگوں کے واقعات بیان کر رہا تھا اور جے رام یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ساری عمر تاریک غار میں بھٹکنے کے بعد ایک ہی جست میں روئے زمین کے بلند ترین پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ چکا ہے۔ اس کی آنکھوں میں امید کی روشنی جھلک رہی تھی۔

رات کے تیسرے پہر جے رام برسوں کے اعتقادات کو چھوڑ کر دائرۂ اسلام

میں داخل ہو چکا تھا۔

زبیر نے پوچھا۔" اب بتاؤ تمھارے دل کا بوجھ ہلکا ہوا ہے یا نہیں؟"

جے رام نے کہا۔" میرے دل میں صرف ایک اضطراب باقی ہے اور وہ یہ کہ میں نے موت کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اسلام قبول کیا ہے۔ کاش میں چند دن اور زندہ رہ کر تمھاری طرح نمازیں پڑھتا اور روزے رکھتا۔"

زبیر نے جواب دیا۔" ایک مسلمان کو خدا سے مایوس نہیں ہونا چاہیے' وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔"

(۲)

پہرے دار نے کسی کو پنجرے کے قریب آتے دیکھ کر آواز دی۔

"کون ہے؟"

ایک آدمی جواب دیے بغیر پنجرے کے قریب پہنچ کر رُکا۔ چند اور سپاہی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے سپاہی نے پھر کہا۔" جواب نہیں دیتے۔ تم کون ہو؟" لیکن اتنی دیر میں چند سپاہی اُسے پہچان چکے تھے اور ایک نے پرانے ساتھی کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔" گنواروں کی طرح آوازیں دے رہے ہو انھیں پہچانتے نہیں، یہ سردار بھیم سنگھ ہیں۔ مہاراج آپ اس وقت کیسے؟"

"میں قیدیوں کو دیکھنے آیا تھا!"

دوسرے سپاہی نے کہا۔" مہاراج! آپ بے فکر رہیں۔ یہ چند آدمی ابھی سوئے ہیں!"

بھیم سنگھ نے اس سے پوچھا۔" تمھارا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔" مہاراج! میرا نام سروپ سنگھ ہے۔"

"تم بہت ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں برہمن آباد کے حاکم سے سفارش کروں گا کہ تمھیں ترقی دی جائے!"

"بھگوان سرکار کا بھلا کرے۔ میرے چار بچّے ہیں۔ آپ کے ہونٹ ہلیں گے اور میرا کام بن جائے گا!"

"تم فکر نہ کرو۔ ہاں قیدی سو رہے ہیں؟"

"مہاراج ابھی باتیں کر رہے تھے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر پنجرے میں جھانک کر دیکھا اور بولا۔ "مہاراج! یہ جاگ رہے ہیں!"

"میں جے رام سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں!"

"مہاراج! آپ کو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر سپاہی نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ پنجرے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

بھیم سنگھ نے پنجرے میں جھانکتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "جے رام تم بہت بے وقوف ہو۔" اور پھر اپنا ہاتھ پنجرے میں ڈال کر زبیر کا بازو ٹٹولتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "تم اپنے ہاتھ میری طرف کرو۔" زبیر نے اپنی پیٹھ پھیر کر اپنے بندھے ہوئے ہاتھ اس کی طرف کر دیے۔ بھیم سنگھ نے دوبارہ بلند آواز میں کہا۔ "نمک حرام! تمھیں راجہ کے سامنے اس ملیچھ عرب کی دوستی کا دم بھرتے ہوئے شرم نہ آئی۔" اور پھر آہستہ سے کہا۔ "جے رام! میں تمھارے ساتھی کے ہاتھوں کی رسیاں کاٹ رہا ہوں۔ کچھ بولو ورنہ سپاہیوں کو شک پڑ جائے گا۔"

جے رام نے چلّا کر کہا۔ "بھیم سنگھ شرم کرو۔ یہ ایک راجپوت کی شان کے شایاں نہیں کہ وہ کسی کو بے بس دیکھ کر گالیاں دے!"

"میں تمھارے جیسے بزدل آدمی کو گالیاں دینا اپنی بے عزّتی سمجھتا ہوں۔

میں صرف یہ پوچھنے کے لیے آیا ہوں کہ تم نے اس لڑکی اور لڑکے کو کہاں چھپایا ہے؟"

"مجھے ان کا کوئی علم نہیں۔ جاؤ مجھے تنگ نہ کرو۔"

زبیر کے ہاتھ آزاد ہو چکے تھے۔ بھیم سنگھ نے اس کے ہاتھ میں خنجر دیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں تمھارے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ تمھارے لیے یہ پنجرہ توڑ کر بھاگ نکلنا ممکن نہیں لیکن پھر بھی قسمت آزمائی کر دیکھو۔ اگر تم آزاد نہ بھی ہو سکے تو کم از کم بہادروں کی موت مر سکو گے۔"

سپاہیوں کو مغالطے میں ڈالنے کے لیے بھیم سنگھ نے اپنا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ عرب لڑکی کو تم نے کہیں چھپا رکھا ہے۔ اچھا تمھاری مرضی، نہ بتاؤ لیکن یاد رکھو، سورج نکلنے سے پہلے برہمن آباد کے باشندے تمھیں پھانسی کے تختوں پر دیکھ رہے ہوں گے۔"

بھیم سنگھ نے پنجرے سے چند قدم دور جا کر سپاہیوں سے کہا۔ "تم ایک طرف کیوں کھڑے ہو۔ مجھے ان سے کوئی مخفی بات نہیں کرنی تھی۔ ذرا اس جے رام کو دیکھو، اس کا غرور ابھی تک نہیں ٹوٹا۔"

سپاہی نے جواب دیا۔ "مہاراج! اس کی قسمت بُری تھی۔ ورنہ ہم نے سنا ہے کہ راجہ اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ مہاراج! شہر کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ عرب جادوگر ہے۔ اس نے جادو کی طاقت سے جے رام کو راجہ کا نافرمان بنا دیا تھا۔"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "شاید یہی بات ہے۔ مجھے بھی اس کے پنجرے کے قریب نہیں جانا چاہیے تھا۔"

"نہیں مہاراج! آپ پر اس کے جادو کا کیا اثر ہوگا ـــــ پھر بھی آپ گھر جا کر پراتھنا کریں۔"

"تم بہت سمجھ دار ہو۔ میں جانتا ہوں، میرا سر چکرا رہا ہے۔ شاید یہ جادو کا اثر ہے!"

"مہاراج! اگر حکم ہو تو ہم میں سے کوئی ایک آپ کو گھر چھوڑ آئے؟"

"نہیں، نہیں!!! اس کی ضرورت نہیں۔"

بھیم سنگھ چل دیا تو سپاہی نے پیچھے سے آواز دے کر کہا۔ "مہاراج! میرا خیال رکھنا!"

"تم فکر نہ کرو!"

"ایشور آپ کا بھلا کرے۔"

بھیم سنگھ کے چلے جانے کے بعد ایک سپاہی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ یہ جادوگر ہے اور تم نہیں مانتے تھے۔ سروپ سنگھ تمھاری خیر نہیں۔ تم کئی بار پنجرے کو ہاتھ لگا چکے ہو۔ اب تک تمھارا سر نہیں چکرایا؟"

"میرا سر ——— ؟ ہاں کچھ بوجھل سا ضرور ہے۔"

"فکر نہ کرو، ابھی چکرانے لگ جائے گا۔"

"سروپ سنگھ نے فکر مند سا ہو کر کہا۔ "لیکن میں نے سنا ہے کہ جادوگر کے مرجانے پر جادو کا اثر نہیں رہتا۔"

"ایسے جادوگر مر کر پھر زندہ ہو جاتے ہیں!"

ایک اور سپاہی بولا۔ "یار میں نے بھی پنجرے کو ہاتھ لگایا تھا۔ میرا سر بھی چکرا رہا ہے۔"

سروپ سنگھ بولا۔ "بھگوان ایسے جادوگر کو غارت کرے۔ اب میرا سر سچ مچ چکرا رہا ہے!"

ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ سپاہی آٹھ دس قدم ہٹ کر پہرہ دینے لگے۔

زبیر پنجرے کے اندر اپنے پاؤں کی رسّیاں کاٹنے کے بعد جے رام کے ہاتھ پاؤں بھی آزاد کر چکا تھا اور دونوں پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ زور آزمائی کر رہے تھے۔

ایک سپاہی نے چلّا کر کہا۔ "ارے وہ پنجرے میں کیا کر رہے ہیں؟"

زبیر اور جے رام دبک کر بیٹھ گئے اور آنکھیں بند کر کے خرّاٹے لینے لگے۔ دو سپاہیوں نے پنجرے کے گرد چکّر لگایا اور مطمئن ہو کر اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔

جے رام نے آہستہ سے کہا۔ "زبیر!"

اس نے جواب دیا۔ "کیا ہے؟"

"یہ سلاخیں بہت مضبوط ہیں۔ قدرت نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے، کیا تمھیں اب بھی چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی امید ہے؟"

"میرا دل گواہی دیتا ہے کہ خدا ہماری مدد کرے گا!"

جے رام نے کہا۔ "برہمن آباد میں سینکڑوں سپاہیوں پر بھیم سنگھ کا اثر ہے شاید وہ آخری وقت پر ہماری مدد کرے۔"

"میں صرف خدا سے مدد مانگتا ہوں اور تمھیں بھی اسی کا سہارا لینا چاہیے اگر اُسے ہمارا زندہ رکھنا منظور ہے تو ہم بھیم سنگھ کی مدد کے بغیر بھی رہا ہو جائیں گے۔"

"میں تمھارے ایمان کی پختگی کی داد دیتا ہوں لیکن بُرا نہ ماننا، یہ سلاخیں خود بخود ٹوٹنے والی نہیں۔"

زبیر نے کہا۔ "جے رام! جہاں عقل کے چراغ گل ہو جاتے ہیں وہاں

ایمان کی مشعل کا کام دیتی ہے۔ تم ایک ایسے خدا پر ایمان لا چکے ہو، جس نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ کو گلزار بنا دیا تھا۔"

جے رام کچھ کہنے والا تھا کہ باہر سے ایک سپاہی چلّایا۔" کون ہے؟"

ایک شخص نے چند قدم کے فاصلے سے جواب دیا۔" جی میں ماہی گیر ہوں!"

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

" جی میں مچھلیاں لایا ہوں"

" مچھلیاں! اس وقت؟"

" جی اب دن نکلنے والا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ انھیں بیچ کر جلدی واپس چلا جاؤں۔ آپ کو کوئی مچھلی چاہیے؟"

ایک سپاہی نے کہا۔" سروپ سنگھ! تم لے لو، تمھارے چار بچے ہیں"

مچھیرے نے کہا۔" ہاں سرکار لے لو! بالکل تازہ ہیں"

سروپ سنگھ نے جواب دیا۔" ہم اس وقت پیسے باندھ کر تھوڑا بیٹھے ہیں۔ مُفت دینی ہے تو دے جاؤ۔"

" جی! شہر کے عام لوگ بھی ہم سے مُفت چھین لیتے ہیں۔ آپ تو سپاہی ہیں، آپ سے پیسے کون مانگ سکتا ہے!"

یہ کہتے ہوئے ماہی گیر نے مچھلیوں کی ٹوکری سپاہیوں کے آگے رکھ دی۔

ایک سپاہی نے کہا۔" ارے تمھارے پاس تو کافی مچھلیاں ہیں۔ ہمیں بھی دو گے یا نہیں؟"

سروپ سنگھ نے کہا۔" نہیں نہیں!! اس بے چارے پر ظلم نہ کرو۔

میں تو اس کا روز کا گاہک ہوں۔ میں مُفت تھوڑا لے رہا ہوں۔ کل پیسے ادا کر دوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے سروپ سنگھ نے ایک مچھلی اُٹھالی اور شرارت آمیز تبسّم کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا اور انھوں نے ہنستے ہوئے آن کی آن میں تمام ٹوکری خالی کر دی۔

سروپ نے کہا۔" لو بھئی! تمھارا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب کل اسی جگہ اور اسی وقت پیسے لے لینا۔"

" بہت اچھا سرکار!"

پنجرے کے اندر زبیر جے رام سے کہہ رہا تھا۔" یہ گنگو ہے لیکن یہ اکیلا کیوں آیا؟"

گنگو نے سپاہیوں سے کہا۔" مجھے الغوزہ بجانا آتا ہے۔ آپ کو سناؤں؟"

سپاہیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔" ہاں ہاں سناؤ!"

گنگو نے الغوزے سے چند دل کش تانیں نکالیں اور اس کے ساتھی عام شہریوں کے لباس میں مختلف گلیوں سے نکل کر سپاہیوں کے گرد جمع ہونے لگے۔ ایک سپاہی نے اپنے ساتھی سے کہا۔" ارے اس نے تو خواہ مخواہ مچھیرے کا ذلیل پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہ تو الغوزہ بجا کر کافی پیسے کما سکتا ہے۔"

گنگو کے ساتھی ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔" مجھے اس کی تانوں نے گہری نیند سے بیدار کیا ہے اور پھر میرا سونے کو جی نہ چاہا"—— " مجھے وسنتی کی ماں کہتی تھی کہ جاؤ دیکھو کوئی فقیر ہو گا"—— " ارے میرے محلّے کے تمام لوگ حیران ہیں کہ یہ کون ہے؟"

گنگو الغوزہ بجاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھی اچانک تلواریں سونت کر سپاہیوں پر پل پڑے اور آن کی آن میں اُن کا صفایا کر دیا۔ داسو نے کلہاڑے کی چند ضربوں سے پنجرے کا دروازہ توڑ دیا اور جے رام اور زبیر لپک کر باہر نکل آئے۔

چوک کے آس پاس کی آبادی نے الغوزے کی دلکش تانوں کے بعد حملہ آوروں اور سپاہیوں کی غیر متوقع چیخ پکار سُنی لیکن اپنے گھروں سے باہر نکل کر دیکھنے کی جرأت نہ کی ——— زبیر اور جے رام گنگو اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ بھاگتے ہوئے شہر سے باہر نکلے۔ گنگو کے چند ساتھی ایک باغ میں گھوڑے لیے کھڑے تھے۔

جس وقت شہر میں اس ہنگامے کا ردِعمل شروع ہو رہا تھا یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر جنگل کا رُخ کر رہے تھے۔

(۴)

ناہید اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور مایا اس کے قریب بیٹھ کر آہستہ آہستہ اس کا سر دبا رہی تھی۔ خالد بے قراری کے ساتھ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا بستر کے قریب کھڑا ہو کر بولا۔ "ناہید بہت دیر ہو گئی۔ انھیں اس وقت تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کاش! میں یہاں ٹھہرنے پر مجبور نہ ہوتا!"

مایا نے خالد کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا کر تسلّی آمیز لہجے میں بولی۔ "مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ راجہ داہر اس قدر ظالم ہو سکتا ہے، ممکن ہے کہ داسو ——— !"

خالد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمھاری نیک خواہشات

ایک بھیڑیے کو انسان نہیں بنا سکتیں۔"

مایا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں، وہ آجائیں گے!"

"زبیر پھانسی پر لٹک رہا ہو اور مجھے فکر نہ ہو۔ کاش! میں گنگو کے ساتھ ہوتا۔" یہ کہتے ہوئے خالد نے اپنی مُٹھیاں بھینچ لیں اور ہونٹ کاٹتا ہوا باہر نکل گیا۔ مایا دیوی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ناہید کی طرف دیکھنے لگی اور وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلّی دیتے ہوئے بولی۔ "مایا! اس نے تمھیں تو کچھ نہیں کہا۔ تم ذرا ذرا سی بات پر رو پڑتی ہو۔"

مایا نے جواب دیا۔ "آج ان کے تیور دیکھ کر مجھے ڈر لگتا ہے۔ اگر وہ ناکام آئے تو کیا ہوگا؟"

ناہید نے کہا۔ "وہ ایک خطرناک مہم پر گئے ہیں اور ان کی کامیابی اور ناکامی میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔"

"اگر گنگو اور اس کے ساتھی بھی لڑائی میں مارے گئے تو آپ اپنے وطن چلے جائیں گے اور میں ......"

ناہید نے جواب دیا۔ "میری ننھی بہن! تم اپنے لیے عرب کی زمین تنگ نہ پاؤ گی!"

"لیکن خالد آج بات بات پر مجھ سے بگڑتے ہیں ممکن ہے کہ وہ مجھے یہیں چھوڑ جائیں۔"

"مایا! میرے سامنے خالد نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ ہاں تمھارے بھائی اور زبیر کے متعلق یہ المناک خبر سُننے کے بعد وہ کچھ بے قرار سا ہے۔ خدا کرے، وہ زندہ بچ کر آجائیں۔ تو پھر خالد کے چہرے پر تمام عمر مُسکراہٹیں دیکھا کرو گی!"

خالد کی مسکراہٹوں کا ذکر مایا کو تھوڑی دیر کے لیے تصوّرات کی حسین دنیا میں لے گیا۔ اسے یہ اجڑی ہوئی دنیا مہکتے ہوئے پھولوں کی ایک کیاری دکھائی دینے لگی۔ وہ پھولوں سے کھیل رہی تھی۔ مہکتی ہوئی ہوا کے جھونکوں سے سرشار ہو رہی تھی۔ چڑیوں کے چہچہے سن رہی تھی۔ وہ ایک عورت تھی جسے محبت تنکوں کا سہارا لینا اور امید دریا کے کنارے مٹّی کے گھروندے بنانا سکھاتی ہے لیکن ایک خیال بادِ سموم کے تیز جھونکے کی طرح آیا اور مایا کے دامنِ امید میں مہکتے ہوئے پھول مُرجھا گئے۔ تصوّر کی نگاہیں عرب کے ریگ زاروں اور نخلستانوں میں گھومنے کے بعد برہمن آباد کے چوراہے میں اپنے بھائی کو پھانسی کے تختے پر لٹکا ہوا دیکھنے لگیں۔ وہ ایک بہن تھی ایسی بہن جو اپنے گھر میں مسرّت کے قہقہے سُننے کے باوجود بھائی کی ایک ہلکی سی آہ پر چونک اُٹھتی ہے۔ مایا نے اپنے دل میں کہا۔ ”بھیّا! میرے بھیّا!! خدا تمھیں واپس لائے۔ تمھارے بغیر مجھے کسی کی مسکراہٹ خوش نہیں کر سکتی!“

ناہید نے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مایا! تمھیں واقعی خالد سے اس قدر محبت ہے؟“

مایا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دوپٹے میں اپنا چہرہ چھپا کر ہچکیاں لینے لگی۔

ناہید نے پھر کہا۔ ”مایا معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں آتا۔ میں خالد کو جانتی ہوں۔ وہ.....“

مایا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”نہیں نہیں!! میں اپنے بھائی کے متعلق سوچ رہی ہوں۔“

قلعے کا ایک پہریدار بھاگتا ہوا آیا۔ ناہید نے اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا لیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

پہریدار نے کہا۔ ”خالد گھوڑے پر زین ڈال رہے ہیں۔ وہ میرا کہا نہیں مانتے۔ انھیں برہمن آباد کا راستہ بھی معلوم نہیں۔ اگر کوئی حادثہ پیش آ گیا تو گنگو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ آپ انھیں منع کریں!“

ایک لمحہ کے لیے مایا کا دل بیٹھ گیا۔ پھر زور زور سے دھڑکنے لگا، وہ اٹھی اور بے تحاشا بھاگتی ہوئی قلعے سے باہر نکل آئی۔ اس کا دل یہ کہہ رہا تھا۔ ”خالد مت جاؤ! مت جاؤ! میں بھائی کا غم برداشت کر سکتی ہوں لیکن تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ خالد مجھ پر رحم کرو۔ خالد! خالد!!“

قلعے سے باہر خالد گھوڑے کی لگام تھام کر اپنا ایک پاؤں رکاب میں رکھ چکا تھا۔ مایا نے بھاگتے ہوئے آواز دی۔ ”ٹھہرو! خدا کے لیے ٹھہرو!! اکیلے مت جاؤ! میں تمھارے ساتھ ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

خالد نے اپنا پاؤں رکاب سے نکال لیا اور پریشان سا ہو کر مایا کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں ناہید بھی باہر آ چکی تھی۔ مایا ناہید کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ”بہن انھیں روکو! یہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ بھگوان کے لیے! خدا کے لیے انھیں روکو!“

ناہید نے ان کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”خالد! اگر تمھارے جانے میں کوئی مصلحت ہوتی تو میں اس بے کسی کے باوجود تمھارا راستہ نہ روکتی۔ تم اکیلے شہر میں راجہ کے تمام لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمھیں گنگو کا انتظار کرنا چاہیے وہ ضرور آئے گا۔ اگر وہ نہ آیا تو اس کا کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور آئے گا۔ بیشک

تم بہادر ہو لیکن ایسے موقع پر صبر سے کام لینا ہی بہادری ہے۔"

خالد نے جواب دیا۔ "آپا! تمھیں بخار ہے۔ تم جا کر آرام کرو۔ میں صرف ان کی راہ دیکھنے جا رہا ہوں۔ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں دور نہیں جاؤں گا۔"

مایا نے کہا۔ "نہیں! نہیں!! بہن! انھیں مت جانے دو۔ یہ واپس نہیں آئیں گے۔"

خالد نے کہا۔ "مایا! ممکن ہے کہ راجہ کے سپاہی ان کا تعاقب کر رہے ہوں۔ ان کی مدد میرا فرض ہے۔ تم اپنے بھائی کا خیال کرو!"

مایا نے جواب دیا۔ "میرا بھائی اگر خطرے میں ہے تو آپ اس کی مدد نہیں کر سکتے۔"

خالد کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن دور سے ایک شخص جو درخت پر چڑھ کر پہرہ دے رہا تھا چلّایا۔ "وہ آ رہے ہیں۔" اور معاً جنگل میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ایک اور پہرے دار بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔ "شاید دشمن ان کا پیچھا کر رہے ہوں۔ تم قلعے کے تہہ خانے میں چھپ جاؤ۔"

خالد نے اطمینان سے جواب دیا "چھپنے کی ضرورت نہیں۔ اگر سپاہی ان کے تعاقب میں ہوتے تو وہ اس طرف نہ آتے۔ لیکن یہ تو بہت تھوڑے گھوڑے معلوم ہوتے ہیں۔ خدا خیر کرے۔"

گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز قریب آ رہی تھی اور خالد نے دوسری بار چونک کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ صرف چار گھوڑے واپس آئے ہیں۔"

گھوڑوں کی آمد کی خبر پا کر ناہید نے اپنے دل میں ایک زبردست دھڑکن محسوس کی اور جب خالد نے یہ کہا کہ صرف چار گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دے رہی ہے تو امید کے چراغ روشن ہو کر اچانک بجھ گئے۔ اس کی حالت غم داندوہ

کے بحرِ بیکراں میں ٹوٹی ہوئی کشتی کے اس ملّاح سے مختلف نہ تھی جو اُٹھتی ہوئی لہر کو ساحل سمجھنے کا دھوکا کھا چکا ہو۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ تقدیر آخری بار امید کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھین رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک گھوڑا جھاڑیوں کے عقب سے نمودار ہوا۔ سوار نے قریب پہنچ کر باگیں کھینچ لیں اور گھوڑے سے کود کر مایا کی طرف بڑھا۔ مایا "بھیّا! میرا بھیّا!!" کہتی ہوئی بھاگ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ ناہید اور خالد کی نگاہیں جھاڑیوں کی طرف تھیں۔ جے رام کو دیکھ کر ناہید زبیر کے متعلق پھر ایک بار امیدوں کے چراغ روشن کر رہی تھی۔ جے رام کے بعد دا سوار اس کے پیچھے گنگو اور زبیر جھاڑیوں کے عقب سے نمودار ہوئے۔ زبیر کو دیکھ کر ناہید جھجکتی ہوئی دو تین قدم آگے بڑھی۔ زبیر اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اُترا۔ خالد بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔ ناہید نے چاہا کہ بھاگ کر اپنے کمرے میں پہنچ جائے لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کے پاؤں زمین میں پیوست ہو چکے ہیں۔ اس کے اعضا میں رعشہ تھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ مہینوں کے تھکے ہوئے مسافر کی طرح منزل کو اچانک اپنے قریب دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔

زبیر خالد سے علیحدہ ہو کر آگے بڑھا اور بولا۔ "ناہید! اب تم اچھی ہو نا!"

وہ جواب دینے کی بجائے اپنے چہرے کا نقاب درست کرنے لگی۔

زبیر نے پھر کہا۔ "ناہید! تمھارا زخم کیسا ہے؟"

ناہید کے ہونٹ کپکپائے، اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپ آ گئے۔ میں ٹھیک ہوں۔" اس کے آخری الفاظ ایک گہری سانس میں ڈوب کر رہ گئے اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔

(۴)

جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ خالد اور مایا کے مغموم چہرے دیکھنے کے بعد اس کی نگاہیں زبیر پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ مُرجھائے ہوئے چہرے پر اچانک حیا کی سُرخی چھا گئی اور وہ اپنے چہرے پر نقاب ڈالتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ گنگو اور جے رام دروازے سے باہر کھڑے تھے۔

خالد نے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "ناہید کو ہوش آ گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

زبیر نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "ناہید! اب ہماری مصیبت ختم ہونے والی ہے، میں آج ہی جا رہا ہوں!"

مایا ایک عورت کی ذکاوتِ حس سے زبیر کے متعلق ناہید کے جذبات کا اندازہ لگا چکی تھی۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "نہیں آپ یہیں ٹھہریں۔ اس وقت سارے سندھ میں آپ کی تلاش ہو رہی ہو گی۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "میرے لیے سندھ کی سرحد پار کرنے کا یہی ایک موقع ہے۔ کل تک تمام راستوں کی چوکیوں کو ہمارے فرار ہونے کی اطلاع مل جائے گی۔ ہمارے باقی ساتھی راجہ کے سپاہیوں کو چکمہ دینے کے لیے مشرق کے صحرا کا رُخ کر رہے ہیں۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ خالد تم یہیں رہو گے۔ اگر اس جگہ کوئی خطرہ پیش آیا تو گنگو تمھیں کسی محفوظ مقام پر لے جائے گا۔ عرب سے ہماری افواج کی آمد تک اگر ناہید گھوڑے پر چڑھنے کے قابل ہو گئی تو گنگو تمھیں مکران پہنچا دے گا!"

ناہید نے کہا۔ "جب تک میری بہنیں قید میں ہیں۔ میں یہیں رہنا پسند کروں گی۔ خدا آپ کو جلد واپس لائے! ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ میرا

خط آپ کو مل گیا ہو گا۔ آپ فوراً روانہ ہو جائیں۔ واپس آنے میں دیر نہ کریں۔ ہاں میں علی کا حال پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"علی آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ دیبل کے گورنر نے اُسے بہت اذیت دی، لیکن وہ ایک بہادر لڑکا ہے۔ وہ خواہ کسی حالت میں ہو۔ نماز کے وقت اذان ضرور دیتا ہے۔ یہ لوگ اذان سے بہت گھبراتے ہیں۔ اسے بارہا کوڑوں کی سزا دی جا چکی ہے لیکن اس کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ برہمن آباد کے قید خانے میں بھی اس کا یہی حال ہے۔ راجہ کے سپاہی اسے زبان کاٹ ڈالنے کی دھمکی دے چکے ہیں لیکن اس کا ارادہ متزلزل نہیں ہوا۔"

ناہید نے کہا۔ "یہ آپ کی صحبت کا اثر ہے۔ ورنہ وہ اتنے مضبوط دل کا مالک نہ تھا۔ سراندیپ میں اسے ایک کمزور لڑکا سمجھا جاتا تھا۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "انسان کے عیوب و محاسن صرف خطرے کے وقت ظاہر ہوتے ہیں۔"

دروازے پر سے گنگو نے آواز دی۔ "اب دوپہر ہونے والی ہے۔ آپ کو دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

ناہید نے کہا۔ "آپ جائیں! خدا آپ کی مدد کرے لیکن آپ کو مکران تک خشکی کا راستہ معلوم ہے؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "داسو میرے ساتھ جا رہا ہے اور وہ تمام راستوں سے واقف ہے۔ میں مکران کی سرحد پر پہنچ کر اُسے واپس بھیج دوں گا!"

مایا نے کہا۔ "لیکن اس لباس میں آپ فوراً پہچانے جائیں گے۔"

زبیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میری ننھی بہن کو میرا بہت خیال ہے لیکن اُسے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں ایک سندھی کا لباس پہن کر جاؤں گا

ہوں۔ اور اب تو میں سندھ کی زبان بھی سیکھ چکا ہوں۔ کوئی مجھ پر شک نہیں کرے گا!"

مایا نے کہا "آپ مجھے بہن کہہ کر بہت سی ذمہ داریاں اپنے سر لے رہے ہیں۔ یاد رکھیے، ہمارے ملک میں دھرم کے بہن بھائیوں کا رشتہ سگے بہن بھائیوں کے رشتے سے کم مضبوط نہیں ہوتا۔ اگر آپ مجھے اپنی بہن کہتے ہیں تو ہفتوں کا سفر دنوں میں طے کیجیے۔ ہماری مصیبت آپ کے ساتھیوں کی مصیبت سے کم نہیں۔ وہ میرے بھائی کی تلاش میں سندھ کا کونہ کونہ چھان ماریں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ کی افواج کے آنے سے مایوس ہو کر کہیں میرا بھائی کاٹھیاواڑ کی طرف فرار ہونے پر آمادہ نہ ہو جائے؟"

جے رام نے باہر سے بلند آواز میں کہا۔ "مایا کیا کہتی ہو۔ میں ایک راجپوت ہوں۔ نہیں، بلکہ ایک مسلمان بھی ہوں۔ میں اپنے محسنوں کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں۔"

"مسلمان؟ میرا بھائی ایک مسلمان؟" مایا یہ کہتی ہوئی ناہید کی چارپائی سے اٹھ کر بھاگی اور باہر نکل کر جے رام سے لپٹ گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ "بھیّا! سچ کہو تم مسلمان ہو گئے؟"

اس نے جواب دیا "مایا! پارس کے ساتھ مس ہو کر لوہا، لوہا نہیں رہ سکتا۔ تم روٹھ تو نہ جاؤ گی؟"

"میں ___؟" اس نے الگ ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں کیسے روٹھ سکتی ہوں۔ خدا نے میری دعائیں سُن لیں۔ میری منّتیں قبول کر لیں۔ بھیّا مبارک ہو لیکن تمھارا اسلامی نام؟"

زبیر نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "یہ میری کوتاہی ہے۔ اگر تم پسند کرو تو

تمھارے بھائی کا نام ناصرالدین رکھتا ہوں!"

"اور میرا نام؟"

خالد، زبیر، گنگو اور جے رام حیران ہو کر مایا کی طرف دیکھنے لگے۔ مایا نے اپنے سوال کا کوئی جواب نہ پا کر کہا "تم حیران کیوں ہو۔ ناہید سے پوچھو۔" وہ یہ کہہ کر دہلیز میں کھڑی ہو گئی اور ناہید کو مخاطب کرتے ہوئے بولی "ناہید بہن! انھیں بتاؤ! کیا میں نے تمھارے سامنے کلمہ نہیں پڑھا؟ کیا میں نے چھُپ چھُپ کر تمھارے ساتھ نمازیں نہیں پڑھیں؟ کیا میں نے قرآن کی آیات یاد نہیں کیں ___؟"

مایا پھر اپنے بھائی کے پاس آ کھڑی ہوئی اور زبیر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ "آپ کس سوچ میں پڑ گئے۔ ناہید میرا نام زہرا رکھ چکی ہے اور مجھے یہ نام پسند ہے۔"

خالد نے اندر آ کر ناہید کے کان میں آہستہ سے کہا۔ "تم نے یہ باتیں مجھ سے کیوں چھُپائیں؟"

ناہید نے مسکرا کر جواب دیا۔ "مایا کو اس بات کا ڈر تھا کہ آپ یہ خیال کریں گے کہ وہ آپ کو خوش کرنے کے لیے مسلمان ہوئی ہے۔ اسے اپنے بھائی کا خوف بھی تھا۔ اس لیے وہ مجھ سے وعدہ لے چکی تھی کہ میں فی الحال اس کا راز اپنے تک محدود رکھوں۔" خالد پھر بھاگتا ہوا جے رام کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اسکی رُوح مسرّت کے ساتویں آسمان پر تھی۔

زبیر نے کہا "بھائی ناصرالدین، بہن زہرا! میں تم دونوں کو مبارک باد دیتا ہوں۔ خدا تمھیں استقامت بخشے۔"

گنگو نے کہا۔ "زبیر! اگر ہمارا دل ٹٹول کر دیکھو تو ہم سب مسلمان ہیں لیکن سب کے لیے نام سوچتے ہوئے تمھیں بہت دیر لگ جائے گی۔ یہ خدمت خالد

کے سپرد کر دو۔ اب دوپہر ہو رہی ہے۔ تمھیں شام تک کم از کم یہاں سے تیس کوس نکل جانا چاہیے۔"

زبیر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تیار ہوں۔"

گنگو نے داسو کو آواز دے کر کپڑے لانے کے لیے کہا۔ زہرا پھر ناہید کے پاس آ بیٹھی اور زبیر نے گنگو کی ہدایت کے مطابق ایک سندھی سپاہی کا لباس زیب تن کیا۔ گنگو نے کہا۔ "آپ کے لیے گھوڑے تیار کھڑے ہیں۔"

"میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ ناہید کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اس کے پاؤں کی آہٹ سُن کر اپنے چہرے پر نقاب ڈال چکی تھی۔

زبیر نے کہا۔ "ناہید! خُدا حافظ۔ بہن زہرا! میرے لیے دُعا کرنا۔"

دونوں نے جواب میں خُدا حافظ کہا اور زبیر لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

خالد، ناصرالدین اور گنگو نے قلعے کے دروازے تک اس کا ساتھ دیا۔

داسو دروازے پر دو گھوڑے لیے کھڑا تھا۔ زبیر خدا حافظ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ داسو نے اس کی تقلید کی۔ گنگو نے کہا۔ "دھوپ تیز ہے لیکن یہ دونوں گھوڑے تازہ دم ہیں۔ تیس کوس کی پہلی منزل ان کے لیے بڑی بات نہیں۔ داسو! اس مہم میں تمھاری کامیابی شاید چند مہینوں میں سندھ کا نقشہ بدل دے۔ جب تک زبیر مکران کی سرحد عبور نہ کرلے، واپس نہ آنا۔"

"آپ بے فکر رہیں۔" یہ کہہ کر داسو نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ زبیر نے اپنا گھوڑا اس کے پیچھے چھوڑ دیا۔

قلعے کے اندر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُن کر زہرا نے ناہید کی طرف دیکھا ناہید کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ "خدا

تمھاری مدد کرے۔ خدا تمھیں دشمنوں سے بچائے۔"

زہرا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور وہ بولی۔ "آپا! تم اب تک مجھ سے ایک بات چھپاتی رہی ہو۔ تمھیں ان سے محبّت ہے؟"

ناہید نے کوئی جواب دیے بغیر زہرا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آہستہ آہستہ ناہید کے کانوں سے دُور ہو رہی تھی۔ آنسوؤں کے موتی اس کی آنکھوں سے چھلک کر رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

زہرا نے اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "بہن وہ جلد آئیں گے۔ وہ ضرور آئیں گے۔"